ماہنامہ قندیل ادب انٹرنیشنل لندن

شمارہ:57 ماہ ستمبر
www.qindeel-e-adub.com
(M) 0044-7886-304637

بانی رُکن۔خان بشیر احمد رفیق مرحوم
چیف ایڈیٹر۔رانا عبدالرزاق خان

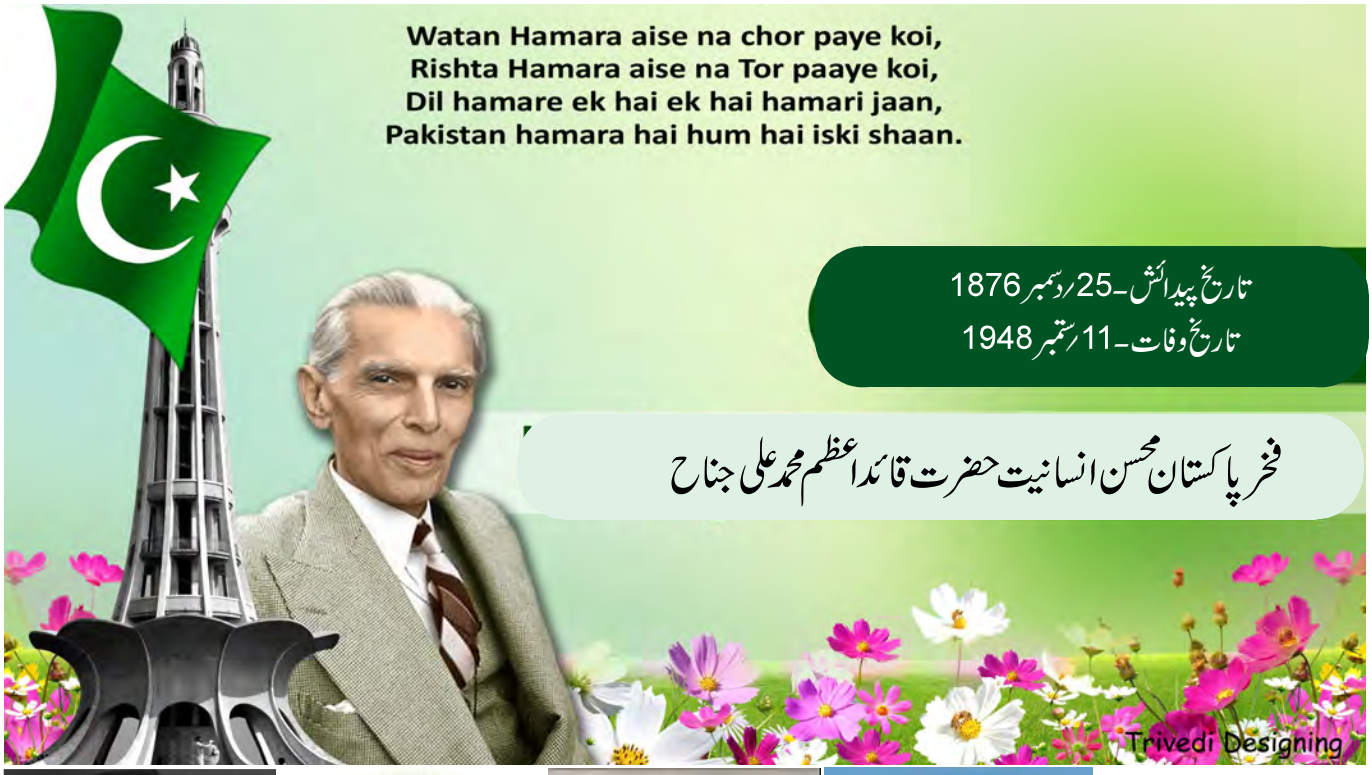

محترمہ فاطمہ جناح | شری جوگندر ناتھ منڈل | محترم حسین شہید سہروردی | محترم لیاقت علی خان | سر محمد ظفر اللہ خان

Qaid-e-azam Said: You are free; you are free to go to your temples. You are free to go to your mosques or to any other places of worship in this State of Pakistan. You may belong to any religion, Caste or Creed... that has nothing to do with the business of the State. We are starting with this fundamental principle that we are all citizens and equal citizens of one State...

مجلس ادارت

زکریا ورک، امجد مرزا امجد، ایم اے حق بھارت،
خواجہ عبدالمومن ناروے، آصف علی پرویز

بانی رُکن : خان بشیر احمد رفیق مرحوم
مدیر : رانا عبدالرزاق خاں
معاون مدیر : سید حسن خان
مدیر خصوصی : سہیل لون
مینجنگ ڈائریکٹر : عاصی صحرائی
فوٹو گرافی : قاضی عبدالرشید، فضل عمر ڈوگر
آڈیو وڈیو : محمد اشرف خاکی

اراکین مشاورتی بورڈ

آدم چغتائی، منور احمد کنڈے، رضیہ اسمٰعیل برمنگھم،
رند ملک کنیڈا، اسلم ناصر آسٹریلیا، اے حق یو کے ٹائمز،
ثقلین مبارک آسٹریلیا، رانا مبارک احمد بحرین،
بشیر احمد خان سویڈن، راجہ منیر احمد،
ڈاکٹر منصور خوشتر بھارت، منور احمد خورشید۔

التماس

ہم سب دوستوں سے التماس کرتے ہیں کہ اپنے ادبی فن پارے، غزل، نظم، افسانہ، مشاعرے کی روئیداد وغیرہ جو بھی اِن پیج میں ارسال کیا جائے گا۔ بلا تفریق اسے معیار کے مطابق شائع کیا جائے گا۔ جو دوست بھیجتے ہیں اُن کی قدر کی جاتی ہے۔ قندیل ادب اکثر ممالک میں لاکھوں قارئین تک جاتا ہے۔ اور ویب سائٹ سے بھی پڑھا جاتا ہے۔ اگر آپ کے پاس ادبی فن پارے کوئی نہیں تو اپنے ریمارکس ہی ارسال کر دیا کریں تاکہ ہم اپنا محاسبہ کرتے رہا کریں۔ شکریہ

رانا عبدالرزاق خاں

فہرست مضامین

مشاعرہ قندیل شعر و سخن تصاویر کی زبانی		4
آپ کے خطوط۔		5
غزلیات: لئیق احمد عابد، اسد اللہ خاں غالب، چوہدری محمد علی، قابل اجمیری، رفیع رضا (غنی غیور) خواجہ عبدالمومن ناروے، جمیل الرحمن، ارشد لطیف، اطہر حفیظ فراز، امۃ الباری ناصر، صابر ظفر، قیصر شیراز، نصیر، نیاز بریلوی، مبارک صدیقی، بشارت احمد بشارت، عبدالحمید حمیدی کنیڈا، عاصی صحرائی، شگفتہ شفیق، آدم چغتائی،		6-11
مشاعرہ قندیل شعر و سخن	رپورٹ عاصی صحرائی	12
دنیا کے متعلق دلچسپ معلومات	تنزیل الرحمان جیلانی	14
داماد ڈاکٹر عبدالقدیر خان سے مربی عبدالقدیر تک	تحریر اصغر علی بھٹی	15
لاہور میوزیم کی پارچہ جات گیلری	شیخ نوید اسلم	18
کافی ہاؤس	ابن صحرا	18
قائداعظم محمد علی جناحؒ اور مختلف مشاہیر کرام	اے آر خان	19
مائیں کتنی سادہ ہوتی ہیں	ثقلین مبارک	20
پاکستان کا قومی ہیرو جنرل اختر حسین ملک	رانا عبدالرزاق خان	23
ایک سبق آموز کہانی	سردار فضل عمر ڈوگر	25
امریکا میں چھپائی کی ابتدا	شرافت علی	26
مؤثر افراد کے 12 راز	رضوان عطا	26
مُلکِ شام کے حالات امام مہدی کا ظہور اور نبی ﷺ کی پیشگوئیاں.....!		28
پاکستان کیسے چل رہا ہے	ابن الوقت	29
قائداعظم محمد علی جناح کے والدین کی شادی کیسے طے پائی؟	محترمہ فاطمہ جناح	30
بہاولپور میں کوڑا صاف کرنے والی ''رولز رائس'' گاڑیاں کارساز کمپنی نے نواب آف بہاولپور سے...	تنزیل الرحمن جیلانی	32
بہترین پوسٹ ہے	احمد کھرل	33
گورکن	فراز حمید خاں	34
زمین ایک سیارہ	ڈاکٹر مہران خان	34
ایک سبق آموز کہانی	سردار فضل عمر ڈوگر	35
کنجوس کا مال	عاصی صحرائی	35
بدترین غلامی کی جانب سفر	مدثر ممتاز مغل	35
پالتو جانوروں کا ذکر	ابن انشاء	38
زروں کی کہانی آصف کی زبانی	آصف پرویز	41

***

مشاعرہ

قندیل شعر و سخن

تصاویر کی زبانی

رپورٹ
صفحہ 11 پر ملاحظہ فرمائیں
عاصی صحرائی

آپ کے خطوط

محمد کولمبس خاں۔مہدی آباد۔جرمنی سے لکھتے ہیں

مکرم برادرم رانا صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کی طرف سے ارسال کردہ قندیل کے مطالعہ کی توفیق ملی۔ اللہ تعالیٰ آپکی مساعی میں برکت ڈالے اور جس لگن سے آپ اس کام میں جُٹے ہوئے ہیں اسکے ثمرات سے آپ کو نوازے۔آمین۔

مکرم راٹھور صاحب از امریکہ کا مضمون ایک بار پڑھا ہے اب اس کو پھر پڑھنا ہے کیونکہ اس سے لذت نچوڑنی ابھی باقی ہے۔اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر دے۔

آپ کے مضمون بابت مرزا غالب میں کچھ باتیں لائق درستی ہیں۔اُمید ہے آپ توجہ دلانے پر بُرا نہیں منائیں گے۔

پہلی بات: یہ ہے کہ آپ نے لکھا ہے ''آج چار سو سال بعد بھی ان کا نام لب پر آتا ہے'' تو یہ چار سو سال نہیں ہیں وہ 1869 میں اس دار فانی سے گزرے ہیں۔اس کے مطابق ان کو ڈیڑھ صد سال کا عرصہ ہوا ہے۔

دوسری بات: چند کتابت کی غلطیاں۔خصوصیات۔بھرپور۔غالب کے نام منسوب شعر میں۔ہو دیکھنا۔کے بجائے۔اور دیکھنا۔لکھا ہے۔اور دوسرے مصرع میں..دیدہ وا۔نہیں بلکہ۔دیدہ دل وا۔۔ہونا چاہیئے تھا

تیسری بات: دائیں طرف آخری لائین میں کچھ لکھنا رہ گیا ہے اور بات مکمل نہیں۔

چوتھی بات: آپ نے ان کے نام جو شعر منسوب کیا ہے۔ظاہر کی آنکھ سے نہ تماشا کرے کوئی۔ایک تو یہ شعر ان کا نہیں لہٰذا اس کو ان کی طرف منسوب کر کے پھر اس کی تشریح غالب کے نہیں اقبال کے حق میں جاتی ہے۔

ظاہر کی آنکھ سے نہ تماشا کرے کوئی
ہو دیکھنا تو دیدۂ دل وا کرے کوئی
منصور کو ہوا لب گویا پیام موت
اب کیا کسی کے عشق کا دعویٰ کرے کوئی
ہو دید کا جو شوق تو آنکھوں کو بند کر
ہے دیکھنا یہی کہ نہ دیکھا کرے کوئی
میں انتہائے عشق ہوں، تو انتہائے حسن
دیکھے مجھے کہ تجھ کو تماشا کرے کوئی
عذر آفرین جرم محبت ہے حسن دوست
محشر میں عذرِ تازہ نہ پیدا کرے کوئی
چھپتی نہیں ہے یہ نگہ شوق ہم نشیں!
پھر اور کس طرح انھیں دیکھا کرے کوئی
اڑ بیٹھے کیا سمجھ کے بھلا طور پر کلیم
طاقت ہو دید کی تو تقاضا کرے کوئی
نظارے کو یہ جنبش مژگاں بھی بار ہے
نرگس کی آنکھ سے تجھے دیکھا کرے کوئی
کھل جائیں، کیا مزے ہیں تمنائے شوق میں
دو چار دن جو میری تمنا کرے کوئی

(علّامہ محمد اقبال)

غالب کی غزل بھی ذیل میں ارسال خدمت ہے

وحشت کہاں کہ بے خودی انشا کرے کوئی
ہستی کو لفظ معنی عنقا کرے کوئی
لخت جگر سے ہے رگ ہر خار شاخ گل
تا چند باغبانی صحرا کرے کوئی
جو کچھ ہے محو شوخی ابروے یار ہے
آنکھوں کو رکھ کے طاق پہ دیکھا کرے کوئی
ہر سنگ وحشت ہے صدف گوہر شکست
نقصاں نہیں جنوں سے جو سودا کرے کوئی
ہے وحشت طبیعت ایجاد یاس خیز
یہ درد وہ نہیں کہ نہ پیدا کرے کوئی
ناکامی نگاہ ہے برق نظارہ سوز
تو وہ نہیں کہ تجھ کو تماشا کرے کوئی
عرض سرشک پر ہے فضائے زمانہ تنگ
صحرا کہاں کہ دعوت دریا کرے کوئی
خوانا نہیں ہے خط رقم اضطرار کا
تدبیر پیچ تاب نفس کیا کرے کوئی
وہ شوخ اپنے حسن پہ مغرور ہے اسد
دکھلا کے اس کو آئنہ توڑا کرے کوئی

غزلیات

نعت

لئیق احمد عابد

حُسنِ یوسف دمِ عیسیٰ یدِ بیضا لکھوں
سبھی اوصاف کا مظہر، تُو ہے یکتا لکھوں

تیری آمد سے گلستانِ نبوت میں بہاریں
گل کہہ کے پکاروں لالہ لکھوں

نام آجائے غلامانِ محمدؐ میں میرا
مجھ سے پوچھو تو یہی حرفِ تمنا لکھوں

نقش در نقش تیرے حُسن کے جلوے دیکھوں
عکس در عکس تیرا چاند اُبھرتا دیکھوں

تیر ہر ایک لیا ہاتھ پہ اور اُف نہ کہا
تیرے عشاق میں اک نام میں طلحہ لکھوں

چشمِ عاشق میں چھلکتا ہوا اک سبز سا رنگ
میں جو دیکھوں تو اسے تو گنبدِ خضرا لکھوں

مجھ کو جس لمحہ میں ہو آپ کا دیدار نصیب
زندگانی کا میں حاصل وہی لمحہ لکھوں

تو ہی اوّل تو ہی آخر تو ہی مقصودِ حیات
تیری چاہت ہی کو میں رُوح کا سجدہ لکھوں

تیری ہر جنبشِ لب وحی الٰہی پیارے
تو جو بولے تو اسے وحی یُوحیٰ لکھوں

تیری مدحت میں کروں وقف میں اپنے اشعار
میں جو لکھوں تو فقط تیرا قصیدہ لکھوں

سارا عالَم ہے تیرا چاہنے والا لیکن
میں تو آقا تجھے اپنا، فقط اپنا لکھوں

اسداللہ خاں غالب

مدت ہوئی ہے، یار کو مہماں کئے ہوئے
جوشِ قدح سے بزم چراغاں کئے ہوئے

کرتا ہوں جمع پھر جگر لخت لخت کو
عرصہ ہوا ہے دعوتِ مژگاں کئے ہوئے

پھر وضعِ احتیاط سے رُکنے لگا ہے دم
برسوں ہوئے ہیں چاکِ گریباں کئے ہوئے

پھر گرمِ نالہ ہائے شرر بار ہے نفس
مدّت ہوئی ہے سیر چراغاں کئے ہوئے

پھر پرسشِ جراحتِ دل کو چلا ہے عشق
سامانِ صد ہزار نمک داں کئے ہوئے

پھر بھر رہا ہے خامہ مژگاں، بہ خونِ دل
سازِ چمن طرازیِ داماں کئے ہوئے

باہم دِگر ہوئے ہیں دل و دیدہ پھر رقیب
نظّارہ و خیال کا ساماں کئے ہوئے

دِل پھر طوافِ کوئے ملامت کو جائے ہے
پندار کا صنم کدہ ویراں کئے ہوئے

پھر شوق کر رہا ہے خریدار کی طلب
عرضِ متاعِ عقل و دل و جاں کئے ہوئے

دوڑے ہے پھر ہر ایک گُل و لالہ پر خیال
صد گلستاں نگاہ کا ساماں کئے ہوئے

پھر چاہتا ہوں نامہ دلدار کھولنا
جاں نزرِ دل فریبیِ عنواں کئے ہوئے

مانگے ہے پھر، کسی کو لبِ بام پر ہوس
زلفِ سیاہ رُخ پہ پریشاں کئے ہوئے

چاہے ہے پھر، کسی کو مقابل میں، آرزو
سرمہ سے تیز دشنہ مژگاں کئے ہوئے

اک نو بہارِ ناز کو تاکے ہے پھر نگاہ
چہرہ فروغِ مے سے گُلستاں کئے ہوئے

پھر، جی میں ہے کہ در پہ کسی کے پڑے رہیں
سر زیر بارِ منّتِ درباں کئے ہوئے

جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن
بیٹھے ہیں تصوّرِ جاناں کئے ہوئے

غالب! ہمیں نا چھیڑ کہ پھر جوشِ اشک سے
بیٹھے ہیں ہم تہیّہ طوفاں کئے ہوئے

چوہدری محمد علی صاحب

عشق بدنام ہے اول دن سے
صلح ہوگی نہ لڑائی ہوگی

وصل در وصل جدائی ہوگی
اشک میں اشک پروئے ہوں گے

آگ سے آگ بجھائی ہوگی
ہم کو بے چین بنا کر پیارے

تجھ کو نیند نہ آئی ہوگی
عشق بدنام ہے اول دن سے

کوئی تو اس میں برائی ہوگی
ہم فقیروں میں بھی آکر بیٹھو

بوریا ہوگا، چٹائی ہوگی
حشر کے روز بقول غالب

''کیا ہی رضواں سے لڑائی ہوگی''
اک طرف ہوگا ہو جانِ خوبی
اک طرف ساری خدائی ہوگی
پھر گیا جانبِ صحرا مضطر
پھر کوئی جی میں سمائی ہوگی

قابل اجمیری

حیرتوں کے سلسلے سوزِ نہاں تک آ گئے
ہم نظر تک چاہتے تھے تم تو جاں تک آ گئے
نامرادی اپنی قسمت، گمرہی اپنا نصیب
کارواں کی خیر ہو، ہم کارواں تک آ گئے
انکی پلکوں پر ستارے اپنے ہونٹوں پر ہنسی
قصہ غم کہتے کہتے ہم کہاں تک آ گئے
اپنی اپنی جستجو ہے اپنا اپنا شوق ہے
تم ہنسی تک بھی نہ پہنچے ہم فغاں تک آ گئے
زلف میں خوشبو نہ تھی یا رنگ عارض میں نہ تھا
آپ کس کی آرزو میں گلستاں تک آ گئے
رفتہ رفتہ رنگ لایا جذبِ خاموشِ عشق
وہ تغافل کرتے کرتے امتحاں تک آ گئے
خود تمہیں چاکِ گریباں کا شعور آ جائے گا
تم وہاں تک آ تو جاؤ، ہم جہاں تک آ گئے
آج قابل میکدے میں انقلاب آنے کو ہے
اہلِ دل اندیشہ سود و زیاں تک آ گئے

رفیع رضا۔(غنی غیور)

حُسن پر جب مرا ایمان ہوا کرتا تھا
کفر میں بھی مَیں مسلمان ہو کرتا تھا
۱۔تیری آیاتِ بدن یاد ہوا کرتی تھیں
اور مَیں حافظِ قرآن ہوا کرتا تھا
۲۔جب سے جاگے ہیں ملاقات نہیں ہو پاتی
خواب کا رابطہ آسان ہوا کرتا تھا
۳۔اب کسی پر بھی اعتبار نہیں
دودھ ماں کا نتھارنا پڑے گا
۴۔قسم خدا کی محبت میں لمس شامل ہے
وگرنہ مَیں کسی پتھر سے پیار کر لیتا
۵۔ در و دیوار پر لہو کیسا؟
آپ کا گھر ہے یا کہ مقتل ہے
۶۔ اِس کو منصب پہ تم بحال کرو
زندگی دیر سے معطل ہے
۷۔ اب تری یاد بھی نہیں آتی
کنجِ تنہائی اب مکمل ہے
۸۔دیکھے جو دوربیں سے ستارے تو رو پڑا
بکھرا ہوا یہ میرا گھرانہ لگا مُجھے
۹۔کُھلی ہوئی تھیں بدن پر رُواں رُواں آنکھیں
نجانے کون ، ملاقات کرنے والا تھا
۱۰میں سامنے سے اُٹھا ، اور لَو لرزنے لگی
چراغ جیسے کوئی بات کرنے والا تھا
۱۲۔مدد کے واسطے ، بنیاد کی طرف سے آ
اُسے سنبھال ، جو مَیں نے سنبھال رکھا ہے
۱۱۔وہ سب درخت مرے بعد، خود ولی ہونگے
مَیں جن کی چھاؤں میں بیٹھا، کلام کرتا ہوں
۱۲۔کہنا تو تھا کہ خوش ہوں تمہارے بغیر بھی
آنسو مگر کلام سے پہلے ہی گر گیا
۱۳۔پتھر میں رزق کیڑے کو دیتا اگر خدا
مرتے نہ لوگ بھوک کے ہاتھوں ، زمین پر
۱۴ کچھ روز مرے ساتھ گزارو تو یہ جانو
اونچائی بھی آ جاتی ہے گہرائی کے اندر
۱۵۔جہاں جہاں کہیں دیوار ہو اندھیرے کی
وہاں وہاں میں اُجالے کا دَر بناتا ہوں
۱۶۔مَیں ترے لمس کو ترستا ہوں
مُجھے تصویر سے نکلنے دے
۱۷۔یعنی تم بھی بہار جیسے ہو
چھوڑ دو گے ،ہرا بھرا کرکے
۱۸۔وہ جو اندھوں کو بھی دکھائی دے
پُھل جھڑی ایسی چھوڑنی ہے کوئی
۱۹۔سوائے اس کے تعارف کوئی نہیں میرا
مَیں وہ پرندہ ہوں جو اپنے پر نہیں لایا
۲۰۔تمام شہرِ سخن کاٹنے کو آتا ہے
فقیر تھک گیا کتے شمار کرتے ہوئے
۲۱۔کھرے بھی پھینک دیئے مَیں نے، ساتھ کھوٹوں کے
جب آیا طیش میں، سکّے ،شمار کرتے ہوئے
مُجھے یہاں کوئی مجھ سا نظر نہیں آتا
مَیں تھک گیا ہوں، فرشتے شمار کرتے ہوئے
۲۳:خدا بناتا ہوں پھر اُس کا ڈر بناتا ہوں
مَیں جتنا نیک ہوں اُتنا ہی شَر بناتا ہوں
۲۴:یہ ذبح خانۂ مذہب ہے کوئی ملک نہیں
جو بچ گئے ہیں ابھی اُن کی فاتحہ بھی پڑھو

خواجہ عبدالمومن ناروے

عقبیٰ اپنی سنوارتے رہنا
اپنا تقویٰ نکھارتے رہنا
اپنے ایماں کی قیمتی دولت
لحہ لحہ سنبھالتے رہنا
ابتلاوں کی تیز آندھی میں
اپنے رب کو پکارتے رہنا
صبر کرنا رضائے باری ہے
صبر اپنا ابھارتے رہنا
تیرا دل بھی رہیگا تب مومن
نفسِ امارہ مارتے رہنا

جمیل الرحمن

ہوا یا آدمی جیسا مسافر
کوئی تو تھا یہاں پہلا مسافر

سرِ رہ ایک بادل رو پڑا تھا
رُکا اور دیر تک بھیگا مسافر

ذرا سی چھاؤں تھی درکار اُس کو
رہا کیوں عمر بھر بیٹھا مسافر

کسی تتلی کے پر دل پر لپیٹے
چمن کے سحر سے نکلا مسافر

سراپا چیخ بن کر گھومتا ہے
ترے کوچے میں اک تیرا مسافر

ستارا ،رات کا ساتھی ازل سے
میں اپنی صبح کا تنہا مسافر

جمیلؔ اک منکشف لمحے سے آئے
مسافت جھوٹ تھی سچّا مسافر

ڈاکٹر منور احمد کنڈے

آپ سے پیار تو ہوا ہی نہیں
کوئی آزار تو ہوا ہی نہیں

کس لئے پھر تمہاری ہمدردی
غم کا اظہار تو ہوا ہی نہیں

اے مسیحا تری ضرورت کیا !
کوئی بیمار تو ہوا ہی نہیں !

پھر یہ زخموں میں کیسی شدت ہے
دوست کا وار تو ہوا ہی نہیں

اور برسو گھٹاؤں کی صورت
صحرا ، گلزار تو ہوا ہی نہیں

وقت کا وار کیسے روکو گے !
عزم ، دیوار تو ہوا ہی نہیں

ہے منوّر جنوں میں کوئی کمی
پیراہن تار تو ہوا ہی نہیں

ارشد لطیف

آسمان نیلا ہے روشنی کے سائے میں
اور فرش پیلا ہے روشنی کے سائے میں

خوشبو کے آوارہ رنگ لطف دیتے ہیں
پھول تو وسیلہ ہے روشنی کے سائے میں

زیر دام رہنا ہے بعد جینے مرنے کے
بول کوئی حیلہ ہے روشنی کے سائے میں

رات دن کی گردش میں حیرتوں کی دیوی نے
ایک طلسم اکیلا ہے روشنی کے سائے میں

فاصلہ تصور کا روز بڑھتا ہے
وقت کتنا ڈھیلا ہے روشنی کے سائے میں

چاند میرے ہاتھوں میں آ گیا تو سورج کا
رنگ کیسا پیلا ہے روشنی کے سائے میں

اطہر حفیظ فراز

اس کو دل میں سنبھال رکھا ہے
جیسے کوئی خیال رکھا ہے

اس کے آنے کی بات مت پوچھو!!
اس نے ایسے ہی ٹال رکھا ہے

اس نے گیسو کے اس اندھیرے میں
اک قیامت کو پال رکھا ہے

میری بستی کے ہر چوراہے پر
میرے دشمن نے جال رکھا ہے

اس کے ہاتھوں کی جنبشیں دیکھوں
اس کے آگے سوال رکھا ہے

ایک لمحے کو رُک گئی گھڑیاں
میرا دل جو نکال رکھا ہے

مجھ کو یاروں سے مالا مال کیا
مجھ میں رَب نے کمال رکھا ہے

اس نے آنچل فراز!! دیکھو تو
گویا چندا پہ ڈال رکھا ہے

امۃ الباری ناصر

جو بے قرار ہو یہ نسخہ آزما لینا
خدا کے ذکر سے دل اور زباں سجا لینا

ہو بچنا کبر کی راہوں سے گر تو کچھ جھک کر
کسی غریب کو بڑھ کے گلے لگا لینا

بہت کٹھن ہے گزارا محبتوں کے بغیر
ذرا پیار سے روٹھے ہوئے منا لینا

جو مال کم ہو تمنا ہو اور مل جائے
تو کارِ خیر میں وہ بھی کہیں لگا لینا

کوئی بھی ساتھ نہیں رہتا گر یہ ہو عادت
ذرا سی بات پہ یوں ہی برا منا لینا

طریق اچھا ہے یہ رزق میں کشائش کا
تو کر کے شکر خدا سے کئی گُنا لینا

جو شام ہوگی تو سورج کو ڈوبنا ہوگا
چراغ کوئی سر شام ہی جلا لینا

اکیلے رہنے کا ڈر ہو اگر ضعیفی میں
تو کر کے خدمتیں ماں باپ کی دعا لینا

وقار کھوتا ہے انسان در بہ در ہو کے
خود اپنے واسطے اک آشیاں بنا لینا

خدا کریم ہے تائب کو بخش دیتا ہے
اسے خوش آتا ہے سائل کا سر جھکا لینا

صابر ظفر

میں تجھ سے آگے جو سوچوں تو دھیان ساتھ نہ دے
اور اپنی جان پہ کھیلوں تو جان ساتھ نہ دے
بس ایک گردشِ پیہم کا ساتھ ہے ورنہ
زمین ساتھ نہ دے آسمان ساتھ نہ دے
میں چاہوں ایسی غلامانہ زندگی سے نجات
اگر تو ساتھ نہ دے تو جہان ساتھ نہ دے
یہ کیسی قوت گویائی دی مجھے تو نے
میں کرنا چاہوں جو شکوہ، زبان ساتھ نہ دے
جمال غیر پہ ایمان کیسے لاؤں ظفر
یہ میرا دل یہ مرا ترجمان ساتھ نہ دے
اپنی تصویر کو آنکھوں سے لگاتا کیا ہے
اک نظر میری طرف دیکھ تیرا جاتا کیا ہے
میری رسوائی میں تو بھی ہے برابر کا شریک
میرے قصے میرے یاروں کو سناتا کیا ہے
پاس رہ کر بھی نہ پہچان سکا تو مجھ کو
دور سے دیکھ کے اب ہاتھ ہلاتا کیا ہے
سفرِ شوق میں کیوں کانپتے ہیں پاؤں تیرے
دور سے دیکھ کے اب ہاتھ اٹھاتا کیا ہے
عمر بھر اپنے گریباں سے الجھنے والے
تو مجھے میرے سائے سے ڈراتا کیا ہے
مر گئے پیاس کے مارے تو اُٹھا ابرِ کرم
بجھ گئی بزم تو اب شمع جلاتا کیا ہے
میں تیرا کچھ بھی نہیں ہوں مگر اتنا تو بتا
دیکھ کر مجھ کو تیرے ذہن میں آتا کیا ہے

غزل

تنہا مَیں سوچتا ہُوں کہ، تنہا مَیں کیا کروں
لوگوں کے جمگھٹوں میں اکیلا مَیں کیا کروں
اوروں کے مشوروں میں میری عُمر کٹ گئی
مَیں نے تو ساری عُمر نہ سوچا مَیں کیا کروں
کیوں کر رہا ہے پھر وُہ ستارے اِدھراُدھر
مَیں نے کب آسمان سے پُوچھا، مَیں کیا کروں؟
ہجرت نے جیسے بانٹ دیا ہے، میرا وجود
آدھا اُدھر پڑا ہُوں یہ آدھا مَیں کیا کروں
اس دشت کے مکیں ہیں بلا کے تماش بین
مَیں سادہ آدمی ہُوں، تماشا مَیں کیا کروں
میرے تو سارے لفظ ہُوئے ہیں لہولہان
اب اس سے بڑھ کے اور دھماکہ مَیں کیا کروں
سَر رکھ کے رونے کی بھی جگہ چاہیئے مجھے
میت کو دے رہے ہو جو کاندھا مَیں کیا کروں
یہ جو زمیں کا قتل ہے یہ میرا قتل ہے
مَیں مَر رہا ہُوں آپ تو نوحہ مَیں کیا کروں
مٹی کا نام اور پتہ جانتا ہُوں مَیں
یہ اپنے خاندان کا شجرہ ، مَیں کیا کروں

قیس شہزاد

سرِ بزمِ تحیر، رُوبروئے یار می رقصم
وفورِ عشق سے امشب، ستارہ وار می رقصم
گزرتے دیکھ کر، اُس کو، اچھالوں پتیاں گل کی
مری گل دستگی دیکھو، سرِ گلزار می رقصم
زمیں ہے اور مَیں رقصاں، برنگِ گردشِ کوزہ
فلک ہے اور مثالِ گردشِ سیار می رقصم
کشش پاتا نہیں ہوں جب بھی موجود و میسر میں
تو اپنا آپ کر کے شاملِ اسرار می رقصم
مری قیمت وصولی جا رہی ہے مجھ کو نچوا کر
نہیں جب تک بکھرتے میرے تن کے تار می رقصم
دوبارہ شاخِ دل پر درد کے پتے نکل آئے
بُھلا دیتا ہوں یہ رنگِ خزاں آثار، می رقصم
جب اُس سے رنگ لاگا ہے تو مجھ کو رنگ لاگا ہے
وہ میرے سنگ جاگا ہے جو خوشبو دار می رقصم
مری وحشت تو میرے پاؤں ٹکنے ہی نہیں دیتی
سرِ خانہ، سرِ محفل، سرِ بازار می رقصم

غزل۔نصیر

کبھی اُن کا نام لینا کبھی اُن کی بات کرنا
مِرا ذوق اُن کی چاہت مِرا شوق اُن پہ مرنا
وہ کسی کی جھیل آنکھیں وہ مِری جُنوں مِزاجی
کبھی ڈُوبنا اُبھر کر کبھی ڈُوب کر اُبھرنا
ترے منچلوں کا جگ میں یہ عجب چلن رہا ہے
نہ کِسی کی بات سُننا نہ کِسی سے بات کرنا
شبِ غم نہ پُوچھ کیسے ترے مُبتلا پہ گُزری
کبھی آہ بھر کے گِرنا کبھی گِر کے آہ بھرنا
وہ تری گلی کے تیور، وہ نظر نظر پہ پہرے
وہ مِرا کِسی بہانے تُجھے دیکھتے گُزرنا
کہاں میرے دِل کی حسرت، کہاں میری نارسائی
کہاں تیرے گیسوؤں کا ترے دوش پر بِکھرنا
چلے لاکھ چال دُنیا ہو زمانہ لاکھ دُشمن
جو تری پناہ میں ہو اُسے کیا کِسی سے ڈرنا
وہ کریں گے ناخُدائی تو لگے گی پار کشتی
ہے نصیر ورنہ مُشکل ترا پار یوں اُترنا

نیاز بریلوی

یار کو ہم نے جا بجا دیکھا
کہیں ظاہر کہیں چھپا دیکھا
کہیں ممکن ہوا کہیں واجب
کہیں فانی کہیں بقا دیکھا
دید اپنے کی تھی اسے خواہش
آپ کو ہر طرح بنا دیکھا
صورتِ گُل میں کھل کھلا کے ہنسا
شکل بلبل میں چہچہا دیکھا
شمع ہو کر کے اور پروانہ
آپ کو آپ میں جلا دیکھا
کر کے دعویٰ کہیں انالحق کا
بر سرِ دار وہ کھنچا دیکھا
تھا وہ برتر ثنا و ما سے نیاز
پھر وہی اب ثنا و ما دیکھا
کہیں ہے بادشاہ تخت نشیں
کہیں کاسہ لئے گدا دیکھا
کہیں عابد بنا کہیں زاہد
کہیں رندوں کا پیشوا دیکھا
کہیں وہ در لباسِ معشوقاں
بر سرِ ناز اور ادا دیکھا
کہیں عاشق نیاز کی صورت
سینہ بریاں و دل جلا دیکھا

اٹھا دو دوستو! اس دشمنی کو محفل سے
شکا یتوں کے بھلا نے کو عید آئی ہے
کیا تھا عہد کہ خوشیاں جہاں میں بانٹیں گے
اسی طلب کے نبھا نے کو عید آئی ہے

مبارک صدیقی

اینا ں وی نہ سویا کر
راتی اُٹھ کے رویا کر
کج نا کج تے کٹناں ای ناں
کجھ نا کجھ تے بویا کر
دنیا دے نل ریساں لا کے
جاں نوں نہ اَدھ مویا کر
اے وی اک عبادت ای اے
ماڑیاں کول کھلویا کر
لوکاں نل اُمیداں لاکے
افسردہ نہ ہویا کر
بہوتا وی نہ ہسیا کر تے
اینا ں وی نہ رویا کر
بول کے جان ای کڈ لیناں ایں
جھلیا منہ تے دھویا کر

عاصی صحرائی

فصلِ بہار کی ہیں یہ محکم نشانیاں
بادِ صبا بھی لائی ہے کچھ مہربانیاں
غنچے چٹخ رہے ہیں ہواؤں کے دوش پر
بڑھتی گئی خزاؤں پر یہ ناتوانیاں
سینے ہیں زخم زخم پر سوچتے ہیں ہم
کیسے ہو ں ختم دشمنوں کی بد زبانیاں
جذبات دھواں بن کے اُٹھے سوئے آسماں
زخمی دلوں میں دفن رہیں بد گمانیاں
دربار میں بکنے کو تو مائل نہیں عاصیؔ
دوستوں کی سدا تجھ پہ رہیں مہر بانیاں

بشارت احمد بشارت

پیار دا دیوا بلدا رہنا
شوق دلاں وِچ پلدا رہنا
بھاویں ہوون کالیاں راتاں
بھاویں ہون چناں نال باتاں
تیرا عاشق چلدا رہنا
عشق دے رنگ وِچ تن من رنگیا
سوہنا ماہی رب توں منگیا
ہجر دا سایہ ٹلدا رہنا
شاماں ہوون سجر سویراں
جس پاسے بھی نظراں پھیراں
چیتا اوہدی گل دا رہنا

عبدالحمید حمیدی کنیڈا

جہاں سے دور ہوتے جا رہے ہیں
بہت رنجور ہوتے جا رہے ہیں
ہم اپنی بے خودی کی خو میں
بہت مجبور ہوتے جا رہے ہیں
کوئی بجلی نہ اب ہم کو جلا دے
مقامِ طور ہوتے جا رہے ہیں
کوئی سورج ہے جس کی روشنی سے
سراپا نور ہوتے جا رہے ہیں
نگاہوں پر پڑے تھے مرے پردے
وہ سارے دور ہوتے جا رہے ہیں
کوئی بھی جام اب رہنے نہ پائے
ذرا مخمور ہوتے جا رہے ہیں
ترے کوچے سے آئے ہیں گزر کر
سو ہم مغرور ہوتے جا رہے ہیں
عماعر رکھتے ہیں تیری نکھارے
ترے مزدور ہوتے جا رہے ہیں
بہت مجبور کر دیتی ہے دنیا
بہت مجبور ہوتے جا رہے ہیں

آدم چغتائی

خندہ دل خندہ جبیں مہر و مرّوت کا بھی پیکر ٹھہرے
کارواں پیار کا آئے تو اُسی شخص کے در پر ٹھہرے

زیرِ تعزیر کیا حُسن کے جلووں کو ستم گاروں نے
وہ زمانے کی نگاہوں میں مقدر کے سکندر ٹھہرے

حلقہء دشمنِ شاطر سے بچا کیسے وہ محمودؔ کا لال
معجزہ ہے یہ جہاں میں جو محبت کی قسم بن کر ٹھہرے

ہائے صد حیف یہ ظُلمت کا زُبوں حال فسوں ساز جہاں
کُلفت و نفرت ِ کردار کے چُبھتے ہوئے خنجر ٹھہرے

اُف یہ ویرانیء ساحل پہ ہوا ایک تماشہء جنوں
جیسے پلکوں میں اُبلتا ہوا اشکوں کا سمندر ٹھہرے

ہم سے مے خواروں کا کیا حال ہوا تیرے چلے جانے سے
کوچہء بادہ فروشوں میں تیرے رند بھی مر کر ٹھہرے

جو کبھی عظمتِ آدمؔ کے چمکتے تھے فروزاں جلوے
تیرے محبوب کی تقدیس و تقدس کے شناور ٹھہرے

سونے کے اعلیٰ زیورات کا مرکز

شریف جیولرز

Sharif Jewellers

Excelling in Gold

EVERYDAY PARTY WEDDING

Excelling in Gold jewellery for more than 60 years

28 London Road, Morden, SM4 5BQ

0044 (20) 36094712

Aqsa Road, Rabwah

0092 (47) 6212515

خوشخبری

ماہنامہ قندیلِ ادب کے پانچ سال مکمل ہونے کی خوشی میں دسمبر ۲۰۱۷ء میں اپنا سالنامہ پرنٹ کاپی کی صورت میں نکالنے لگا ہے۔ جو کہ دسمبر کے شروع میں شائع ہو جائے گا۔ کاروباری حضرات اپنے اشتہار دینا نہ بھولیں۔ جیسا کہ احباب کو معلوم ہے کہ قندیل ادب انٹرنیشنل لاکھوں قارئین تک ساری دنیا میں جاتا ہے۔ اور ویب سائٹ www.qindeel-e-adub.com سے بھی پڑھا جاتا ہے۔ اپنے کاروبار کی ترقی کے لئے ہم سے رابطہ کریں۔ اشتہار کے نرخ مندرجہ ذیل ہیں۔

رانا عبدالرزاق خان چیف ایڈیٹر
قندیل ادب انٹرنیشنل لندن

07886304637, 02089449385 e-mail: ranarazzaq52gmail.com

FREQUENCY	Three Issues		Six Issues		12 Issues	
Page Size	Price per Issue	Total Amount	Price per Issue	Total Amount	Price per Issue	Total Amount
Full Page	£140	£420	£120	£720	£120	£1440
Half Page	£70	£210	£60	£360	£60	£720
Quarter Page	£40	£120	£35	£210	£35	£420

مشاعرہ قندیل شعر و سخن

رپورٹ
عاصی صحرائی

قندیل و شعر و سخن لندن کے زیر اہتمام ایک انٹرنیشنل مشاعرے کا انتظام کیا گیا جو کہ 3/اگست ۲۰۱۷ بروز جمعرات یاسمین ہال اپر ٹوٹنگ روڈ لندن میں منعقد ہوا۔ جس کے منتظم اعلیٰ رانا عبدالرزاق خان معروف شاعر و ادیب و نام نگار، کالم نگار و ایڈیٹر ماہنامہ قندیل ادب انٹرنیشنل لندن تھے۔ صدر مجلس شاعر و ادیب جناب مبارک احمد صدیقی تھے۔

مہمانانِ خصوصی ڈاکٹر سر افتخار احمد ایاز صاحب، برمنگھم سے ڈاکٹر نکہت افتخار صاحبہ مشہور شاعرہ، اور آدم چغتائی، پاکستان سے تشریف لئیق احمد عابد شاعر و ادیب و مقرر، ناروے سے جناب زرتشت احمد منیر احمد خاں، لندن سے مظفر احمد چوہدری معروف تاجر تشریف لائے۔ مشاعرہ پاکستان کی ستر ویں یوم آزادی کی مناسبت سے تھا۔ کنیڈا سے عبدالحمید حمیدی، گلاسگو سے داؤد ساجد قریشی، جرمنی سے اسحاق اطہر اور اسحاق عاجز، لندن سے محترم امجد مرزا امجد، طفیل عامر سندھو، گلزیب زیبا، ڈاکٹر صوفیہ سطوت، فرحانہ غزالی، عابدہ شیخ، نیلم جوگن، نوجوان شعراء میں سے

عامر امیر، ساجد محمود رانا، نورالجمیل نجمی، بسم اللہ کلیم، پروفیسر عبدالقدیر کوکب، بزرگ شعراء شائق نصیر پوری، رانا عطاء اللہ، واحد اللہ جاوید، عاصی صحرائی، اور بہت سے شعراء تشریف لائے۔ تلاوت اور حمدیہ کلام کے بعد ناظم مشاعرہ رانا عبدالرزاق خان نے سب احباب کو خوش آمدید کہا۔ اور تشریف لانے پر سب کا شکریہ بھی ادا کیا۔ پہلے دور میں سب شعراء نے اپنا منفرد کلام سنا کر محفل کو چار چاند لگا دیئے۔ دوسرے دور میں مہمان شعراء

(ڈاکٹر نگہت افتخار صاحبہ، لئیق احمد عابد) نے کلام سنا کر مشاعرہ لوٹ لیا۔ سامعین نے خوب داد دی اور سب بہت ہی محظوظ ہوئے۔ ہر طرف سے واہ واہ کے دونگڑے برسائے جا رہے تھے۔ اور مکرر، مکرر کی آوازیں آ رہی تھیں۔ نوجوان شعراء کے کلام ِ جاں فزا نے سامعین کے دل جیت لئے۔ صدر محفل مبارک صدیقی نے سامعین کے اصرار پر اپنا کلام بھی سنایا جو کہ بہت سراہا گیا۔ آخر پر اسحاق عاجز نے طاہر عدیم کا کلام سنایا جو کہ وطن کا ایک ترانہ تھا۔ پاکستان کے ترانے نے تو ایک سماں باندھ دیا۔ ساری محفل ساتھ مل کر وطن کا ترانہ گنگنا رہی تھی۔ رات بھیگ رہی تھی۔ C44 ٹی وی چینل لائیو نشر کر رہا تھا۔ اور احباب خوب خوش تھے۔ آخر پر جناب ڈاکٹر سر افتخار احمد ایاز صاحب، جناب زرتشت احمد منیر احمد

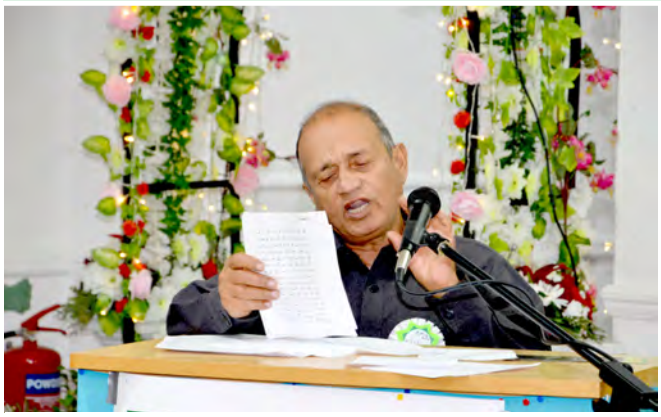

خاں، رانا عبدالرزاق خان نے سب کا شکریہ ادا کیا۔ آخر میں سب حاضرین کی خدمت میں کھانا پیش کیا گیا۔ یہ ایک خوبصورت یادگار مشاعرہ تھا۔

***

داماد ڈاکٹر عبدالقدیر خان سے مربی عبدالقدیر تک

(تحریر اصغر علی بھٹی)

یوں تو پاکستان کی ارض پاک میں صاحب اقتدار اور مصاحبین اقتدار۔ طاقت کے نشے میں چور ہوکر بڑے بڑے عجیب وغریب کام سرانجام دے چکے ہیں اور دیتے جارہے ہیں۔ کسی ڈکٹیٹر کا منہ زور بیٹا ایک ہی گھر سے دو دو بیٹیوں کو اغوا کرلیتا ہے تو دوسرا جابر حاکم اپنے مخالف سیاستدان پر بھینس چوری کا مقدمہ ڈال کر اسے حوالات کی ہوا کھلا دیتا ہے۔ ایک حاکم وقت جو خود اپنے لیے تو شراب پینے کی دعویداری رکھتا تھا مگر دوسروں کے لیے مفتی اسلام بن جاتا ہے اور لاکھوں معصوم کلمہ گووں کو کافر قرار دینے کا سرکاری فتویٰ جاری کر دیتا ہے۔ یہاں ایک طرف مولوی بٹن دبا کر جنت میں جانے کی نئی نویلی اصطلاح ایجاد کرتا ہے تو دوسری طرف اقتدار کا ایک بھوکا ڈکٹیٹر، جو 90 دن کو 11 سال میں بدلتے بدلتے، اقتدار کے نشے میں اتنا زودحس واقع ہوجاتا ہے کہ اسے آذان اور السلام علیکم کی آواز ہی بری لگنے لگ جاتی ہے۔ وہ مساجد پر سے لکھے کلمہ کے الفاظ کو تڑوانے کے آرڈر دیتا ہے اور درود پڑھنے والوں کو قید بامشقت کے پروانوں سے نوازنا شروع کر دیتا ہے۔

دوستو! جس قوم کی اذان کی آواز سے دل آزاری ہونے لگ جائے۔ جو کلمہ لکھنے والوں کو مجرم قرار دے دیں۔ جو اعتکاف پر بیٹھنے کے لیئے چھٹی مانگنے والوں کو کال کوٹھڑیوں میں بند کردیں تو پھر اس قوم کے اساتذہ کون سی دینیات پڑھانا شروع کر دیتے ہیں؟ اور ان کو کون سی کہانیاں پسندیدہ ہوجاتی ہیں؟

اقتدار کے نشے میں مست حکمرانوں کی دینیات کیا ہوجاتی ہے؟ ان کے لیے قانون کیسے خدمتگار بنکر کھڑا ہوتا ہے؟ اور وقت کے حسین کے لیئے قاضی عبدالشریح کیا کیا فیصلے کرتے ہیں 1996 کا سال پاکستان کی عدالتی تاریخ میں اس لحاظ سے ایک اہم سال تھا جب پہلی دفعہ تعزیرات پاکستان دفعہ 298 سی 295 سی اور دفعہ 295 اے کے تحت شرق پور کے سکہ بند کافروں کے ساتھ ساتھ اسلام آباد میں ایک سکہ بند مسلمان پر بھی انہیں دفعات کے تحت مقدمہ درج ہوا آیئے شرق پور سے اسلام آباد تک پھیلی اس کہانی کو سنتے ہیں۔

☆نوعیت وحیثیت ملزمان

دوستو! بات کوئی زیادہ پرانی نہیں ہے۔ یہ 28 اکتوبر 1988ء کی سہ پہر تھی جب مکرم عبدالقدیر شاہد صاحب مبلغ سلسلہ جماعت احمدیہ سمیت تین احمدیوں کے خلاف شرق پور تھانہ میں ایک ایف آئی آر زیر دفعہ 298 سی درج ہوئی۔ جرم کس قدر سنگین ہوگا کہ قانون نے حرکت میں آتے ذرہ دیر نہ لگائی اور اس قدر سرعت سے حرکت میں آیا کہ رات کے گیارہ بجنے سے پہلے پہلے تمام ملزمان کو سلاخوں کے پیچھے دھکیلا جاچکا تھا۔ یہ تینوں ملزمان سالوں سال جیل کی کال کوٹھڑیوں اور عدالتوں کی روشوں میں سے دھکے کھاتے ہوئے 1996ء کے سال میں، ایک دفعہ پھر اکتوبر کے مہینے میں سے 26۔ اکتوبر کی دوپہر سے گزر رہے تھے کہ اچانک اسلام آباد پولیس نے ایک سکہ بند مسلمان جناب مکرم سعد خاں صاحب فرزند ارجمند محترمہ صبیحہ ضمیر صاحبہ وایڈمرل ضمیر صاحب وداماد گرامی جناب ڈاکٹر عبدالقدیر صاحب آف اٹامک انرجی، مالک فرابلز انٹرنیشنل اسکول واقع ایف سیون ٹو اسلام آباد کے خلاف زیر دفعہ 298 سی اور 295 اے مقدمہ درج کر مارا۔ یاد رہے یہ وہی سکول ہے جس میں اس وقت بینظیر بھٹو صاحبہ کے بچے جناب بلاول زرداری بھٹو اور آصفہ سمیت ملک کی اہم ترین مقتدر شخصیات کے بچے زیر تعلیم تھے۔

یعنی مختصراً یہ کہ احمدی ملزمان، تین سادہ سے غریب لوگ۔ ہوسکتا ہے ان میں سے بعض کو شرقپور کے محلے کے لوگ بھی پوری طرح نہ جانتے ہوں۔ ایک سلسلہ احمدیہ کا مبلغ۔ نماز پڑھانے اور اللہ رسول کے احکام کی اشاعت کے لیئے اپنی پوری زندگی وقف کرنے والا اور اسی کل سرمایہ حیات کا مالک۔ دوسری طرف جناب مکرم سعد خان صاحب ایک ایڈمرل کا بیٹا، طاقتوروں کا نواسہ، جناب ڈاکٹر عبدالقدیر صاحب کا داماد اور خود ملک کے چند بڑے مہنگے اور معروف سکول اور کالجوں میں سے ایک سکول یعنی فرابلز انٹرنیشنل اسکول واقع ایف سیون ٹو اسلام آباد کا مالک۔

آگے چلیے..

☆مقدمہ درج کرتے ہوئے مجبوری یا سرعت کی نوعیت

28 اکتوبر 1988ء کی دوپہر، شرق پور تھانہ میں ایک مولوی صاحب نے احمدی ''ملزمان'' کے خلاف مقدمہ درج کرنے کی درخواست کی جو فوری قبول کرتے ہوئے اسی وقت نہ صرف زیر دفعہ 298 سی ایف۔آئی۔آر کاٹ دی گئی بلکہ رات ڈھلنے سے پہلے پہلے ملزمان کو سلاخوں کے پیچھے بھی پہنچا دیا گیا۔ یہاں سے ان غریب شرفاء کے وارثین ضمانت کی بھاگ دوڑ کے لیئے نکل کھڑے ہوتے ہیں.....سالوں پہ سال گزرتے رہے۔ مجسٹریٹ سے لیکر سپریم کورٹ تک یہ بھاگ دوڑ جاری رہی۔سپریم کورٹ نے کیس کی ''سنگینی'' کے مدنظر ضمانت دیئے بغیر کیس واپس بھیج دیا۔بعد تفتیش، 1989 میں پولیس نے مجسٹریٹ کی عدالت میں مقدمہ برائے سماعت داخل کیا۔3 سال کچہریوں کے چکر لگوا لگوا کر آخر کار 1991ء میں احمدیوں پر چارج شیٹ لگائی گئی

مزید دو سال یعنی 1993ء تک گواہیاں ریکارڈ ہوتی رہیں اور 25 اگست 1993ء کو یہ کام مکمل ہو گیا صرف فیصلہ سنانا باقی تھا۔14 ماہ مزید گزر چکے تھے۔یہاں ایک طرف ان مظلوم احمدیوں پر جیل کی راتیں لمبی ہوتی جارہی تھیں تو دوسری طرف ''مدعیان اسلام'' کو ایک احساس بری طرح تڑپا رہا تھا کہ گناہ بڑا ہے جبکہ جرم کی دفعہ چھوٹی ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ ''خوفناک ملزم'' تھوڑی سی سزا پا کر پھر کہیں ایسے ہی مزید جرم کے ارتکاب کے لیئے آزاد ہو جائے۔ چنانچہ مقدمہ درج ہونے کے 6 سال بعد یعنی 17 اکتوبر 1994 کو یہ مولویان حضرات ایک دفعہ پھر عدالت میں دل کی آہ وزاری کی داستان لیکر پہنچ گئے اور درخواست دی کہ ملزمان کے اس گھناونے جرم کے مقابل پر دفعہ 298 سی درست نہیں جس کی سزا صرف تین سال ہے اور استدعا کی دفعہ 295 اے اور 295 سی کا اضافہ کیا جائے جس کی سزا موت ہے اس درخواست کی سماعت مجسٹریٹ مکرم محمد صدیق صاحب نے 7 مارچ 1995 کو شروع کی اور 19 مارچ 1995 کو فیصلہ بھی سنا دیا کہ واقعتہً زیادتی ہوئی ہے جرم زیادہ سنگین ہے جو دفعہ 295 سی میں آتا ہے۔جو اس عدالت کے دائرہ کار سے باہر ہے۔اور مسل مقدمہ سیشن جج شیخوپورہ کو بھجوادی۔

اس طرح یہ مقدمہ ایڈیشنل سیشن جج شیخوپورہ محمد محمود چوہدری صاحب کی عدالت میں پیش ہوا جنہوں نے فیصلہ دیا کہ اس مقدمہ میں اس گناہ پر 295 سی کا اطلاق نہیں ہوتا۔لہٰذا ٹرائل مجسٹریٹ صاحب فیصلہ 298 سی کے تحت سنا دیں۔مگر ٹرائل مجسٹریٹ محمد صدیق صاحب نے 29 اگست 1995ء کو ایک بار پھر فیصلہ سنا دیا کہ اس گناہ پر توہین رسالت 295 سی ہی لگتی ہے اور مسل دوبارہ ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج شیخوپورہ کو بھجوادی۔۔اب کی بار ایڈیشنل سیشن جج محمد محمود چوہدری صاحب تبدیل ہو چکے تھے اب ان کی جگہ رانا زاہد محمود صاحب مقرر ہوئے تھے چنانچہ مقدمہ ان کی عدالت میں پیش ہوا۔احمدی احباب کے وکیل نے پیش ہو کر 17 دسمبر 1995ء کو درخواست دی کہ چونکہ لوئر کوٹ نے یہ فیصلہ دیا پہلے اس مقدمہ میں دفعہ 298 سی کا فیصلہ فرمادیں مگر سیشن جج نے کہ اس مقدمے میں 295 سی کا اطلاق نہیں ہوتا اس لئے مورخہ 15 جولائی 1997ء کو یہ درخواست مسترد کر دی۔اس کے بعد ہائی کورٹ رجوع کیا گیا۔ہائی کورٹ میں 29 جولائی اور 31 جولائی کو بحث ہوئی ۔جسٹس محمد نعیم صاحب نے اپنے فیصلہ میں اس بڑے گناہ کے لیے 298 سی کو ناکافی قرار دیتے ہوئے 295 سی کو برقرار رکھنے کا حکم صادر فرمایا اور ساتھ ہی ایڈیشنل سیشن جج رانا زاہد محمود کو اس مقدمہ کی سماعت کرنے اور 30 دسمبر 97ء تک فیصلہ فرمانے کا حکم دے دیا۔

ہائی کورٹ کے بعد سپریم کورٹ میں اپیل دائر کی گئی اور ساتھ ہی سٹے آرڈر کی درخواست بھی کی گئی۔مگر سپریم کورٹ کے جسٹس نثار صاحب نے نہ صرف اپیل خارج کر دی بلکہ رانا زاہد محمود صاحب کو کہا کہ کیس کا فیصلہ 30 نومبر 1997ء (یعنی مزید ایک مہینہ جلدی) تک کر دیا جائے چنانچہ یکم دسمبر 1997ء کو رانا زاہد محمود نے فیصلہ صادر فرمایا کہ ملزمان کو 25-25 سال قید بامشقت اور 50-50 ہزار جرمانہ اور عدم ادائیگی کی صورت میں 2،2 سال مزید قید۔

نوٹ:88ء میں جب یہ مقدمہ شروع ہوا تو 295 سی کی سزا موت تھی مگر جب 1997ء میں فیصلہ ہوا تو قانون بدل کر سزا عمر قید ہو چکی تھی۔اس لیے صرف عمر قید سزا ہوئی۔ یہ احمدی ملزمان 10 سال تک عدالتوں کی خاک چھان چھان کر اور انصاف کے ایوانوں میں حاضریاں

دے دے کر آخر 25،25 سال سزا یعنی عمر قید کا پروانہ لیکر شیخوپورہ جیل کی اندھی سنسان کال کوٹھڑیوں کی طرف روانہ ہو چکے ہیں۔

شرق پور کے ان ''خوفناک ملزمان'' کو یہیں چھوڑ کر اسلام آباد کے ''شرفاء ملزمان'' کی طرف چلتے ہیں۔

اکتوبر 1996ء کی شام سابق ڈی جی آئی ایس آئی جنرل حمید گل کی

نواسی اپنے سکول فرابلز انٹرنیشنل سے واپس آئی اور اپنی امی عظمیٰ گل کو بتایا کہ ان کے سکول میں اسلامیات کے نام پر کیا کیا عجیب وغریب اشیاء پڑھائی جا رہی ہیں۔(تفصیل آگے بتاتے ہیں)

عظمیٰ گل صاحبہ یہ سب سن کر بہت حیران ہوئیں اور فوراً تھانہ کوہسار میں مقدمہ درج کروانے پہنچ گئیں ۔ مدعیا اگر جنرل حمید گل صاحب کی صاحبزادی تھیں تو نامزد ملزمان بھی کوئی شرق پور کے غرباء نہیں تھے۔نتیجہ صاف ظاہر تھا۔تھانے دار صاحب نے مقدمہ درج کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ لیکن اگر جناب مکرم سعد خاں صاحب محترمہ صبیحہ ضمیر صاحبہ وایڈمرل ضمیر صاحب کے فرزند ارجمند اور جناب ڈاکٹر عبدالقدیر صاحب آف اٹامک انرجی کے داماد گرامی و مالک فرابلز انٹرنیشنل اسکول واقع ایف سیون ٹو اسلام آباد تھے تو جناب عظمیٰ گل صاحب بھی آئی ایس آئی کے پاورفل ترین ڈی جی کی صاحبزادی تھیں۔نتیجہ وہی ہوا اسلام آباد پورا نعروں کی زد میں آ گیا۔

اکتوبر 1996ء کی صبح ،80 کے قریب وکلاء آف اسلام آباد بار ایسوسی ایشن نے ایک قرارداد منظور کی اور کمشنر اسلام آباد کے دفتر کا گھیراو کر لیا۔اور رپورٹ درج کرنے کا مطالبہ کیا۔کمشنر صاحب نے ڈی سی صاحب اور ایس ایس پی کیپٹن جمیل صاحب کو بلوایا اور عظمیٰ گل صاحبہ کا موقف سنا اور اس کے بعد انتہائی پریشانی سے ایف آئی آر زیر دفعہ 295 اے اور 295 سی ایف آئی آر کاٹ دی۔ کاٹنے کا عندیہ دے دیا۔چنانچہ سوا گیارہ بجے تھانہ انچارج انسپکٹر فرحت عباس کاظمی نے رپورٹ تو درج کر لی گئی لیکن اس رپورٹ میں کاریگری یہ رکھی گئی کہ تھانہ یہ معاملہ لیگل برانچ کو بھیجے گا جس کے بعد یہ فیصلہ ہوگا کہ یہ مسئلہ توہین رسالت کا ہے یا نہیں۔بعد میں ایف آئی آر کو سیل اور پھر خارج کر دیا گیا۔نہ ہی کوئی گرفتاری ہوئی۔نہ ہی کوئی مقدمہ چلا،نہ ہی کوئی سزا ہوئی۔

☆ملزمان کے وقوعہ کی نوعیت

1988 تا 1997 تک پھیلے ہوئے شرق پور کے مقدمہ میں دو جرم لکھے گئے تھے۔گھر کے دروازے پر نہ صرف کلمہ طیبہ لکھنے کا جرم کیا بلکہ جب اس کو مٹانے کا کہا گیا تو انہوں نے صاف انکار کر دیا۔اور جبکہ اسلام آباد کے سکہ بند مسلمان جناب سعد خان صاحب کی ایف آئی آر اپنے عقائد کی تبلیغ کیسیل کر دی گئی تھی جس کی وجہ سے تفاصیل تو باہر نہیں آسکی مگر فرابلز انٹرنیشنل سکول میں پڑھائی جانے والی اسلامیات کی کتاب کی مکمل تفصیلی رپورٹ ہفت روزہ تکبیر 14 نومبر 1996ء میں زیر عنوان ''افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی''صفحہ 8 تا 11 اور اسی شمارے میں زیر عنوان ''کفر کی تعلیم اور توہین رسالت''16 تا 19 ملاخطہ کی جاسکتی ہے۔نقل کفر،کفر نہ باشد۔دل پر ہاتھ رکھ کر صرف چند خلاصہ کے الفاظ درج کرتا ہوں تا کہ اس پہیلی کا انجام لکھ سکوں۔زمین وآسمان خدائے واحد نے نہیں بلکہ تین خداؤں زیم،می بیر،اور نکوا نے بنایا۔

نبی کریم ﷺ نعوذ باللہ ثم نعوذ باللہ کی بطن مادر کے اندر کی تصویر کشی۔ اللہ کے تخت کے چار پایوں کو چار درندوں نے سہارا دیا ہوا ہے

''خدا کے خلاف بغاوت'' کے تحت ذکر ہے کہ زیم۔می بیر اور نکوا نامی خداؤں نے اپنے جیسی مخلوق انسان بنائی اور پہلے انسان کا نام ''فیم'' رکھا۔اس کو عقل اور حسن دیا مگر یہ فیم دیگر جانوروں سے خوبصورت ہونے کی وجہ تکبر کرنے لگا اور خدا سے بغاوت کے نغمے الاپنے لگا۔خدا نے غضب ناک ہو کر پوری دنیا پھونک ڈالی لیکن چونکہ تخلیق کرتے وقت وہ کہہ چکا تھا کہ تم کبھی نہیں مرو گے اس لیے یہ پہلا انسان جل جانے کے باوجود زندہ ہے۔خدا نے زمین پر نگاہ ڈالی اور اسے خاکستر دیکھ کر شرمندہ ہوا اور درخت اگا دیئے۔''روشنی اور روحیں''نامی باب میں حضرت جبرائیل اور اسرافیل اور عزرائیل کی تصاویر کشی۔اور بہت کچھ خرافات استغفر اللہ من الخرافات کلھا۔

☆انجام کی نوعیت

کلمہ نہ مٹانے والے'' کافر'' اپنے جرم کی سزا بھگتنے سے بھی پہلے 9 سال تک جیل کی سلاخوں کے پیچھے بند رہے تاہم بعد میں عمر قید کی سزا کا پروانہ لیکر شیخوپورہ جیل میں واصل ہو چکے ہیں۔جبکہ اس دنیا کے پروردگار کا نام اللہ کی بجائے زیم اور وحدہ لاشریک کی بجائے تین خدا بتانے اور پڑھانے والے کو کسی نے فٹے منہ بھی نہ کہا۔ہے نہ مزیدار پہیلی؟

اقتدار کے نشے میں مست حکمرانوں کو تو شائد اس پاکستانی پہیلی کا انجام سوچنے کی فرصت نہ ہوگی لیکن حضرت ثعبان ثوریؒ کا قول اس موقعہ پر بہت یاد آرہا ہے آپ نے فرمایا تھا:''مبارک ہیں وہ لوگ جن کے پاس نصیحت کرنے کے لیے الفاظ نہیں اعمال ہوتے ہیں۔''

اور حضرت مولانا رومیؒ کا قول کہ:''جس کے افعال شیطان اور درندوں جیسے ہوتے ہیں کریم لوگوں کے متعلق اس کو بدگمانی ہوتی ہے۔''

آج جبکہ ڈاکٹر قدیر صاحب کا خاندان بھی انصاف کے حصول کے

لیے ایوان عدل کی زنجیریں ہلانے میں مصروف ہے تو ایسے میں مجھے اسیر راہ مولا مکرم عبدالقدیر صاحب مبلغ سلسلہ کا چہرہ جناب چوہدری محمد علی صاحب کے اس شعر کی سراپا تصویر بنا نظر آتا ہے

تو فیصلہ تو کر مگر اتنا نہ مسکرا کہ اک اور فیصلہ ہے اس فیصلے کے بعد

نوٹ: فرابلز انٹرنیشنل سکول کے بارے میں مکمل رپورٹ ہفت روزہ تکبیر 14 نومبر 1996ء میں زیر عنوان ''افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی''صفحہ 8 تا 11 اور اسی شمارے میں زیر عنوان ''کفر کی تعلیم اور توہین رسالت''صفحہ 16 تا 19 ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔ ***

لاہور میوزیم کی پارچہ جات گیلری

شیخ نوید اسلم

لاہور میوزیم کی پارچہ جات گیلری میں مختلف پارچہ جات کے نمونوں کے علاوہ رومالوں کا ذخیرہ اور لکھنو کے دستکاروں کی مٹی کی بنی ہوئی اشیا عوام کے لیے بہت دلچسپی کی حامل ہیں۔ پارچہ جات میں سوتی، اونی، ریشمی، گولڈ فائبر، سادہ، پرنٹیڈ، رنگے ہوئے اور کڑھائی کے نمونے شامل ہیں۔ بنگلہ دیش، مغربی بنگال اور بنارس کا بروکیڈ ہے۔ ملتان، لاہور اور بہاولپور کی لنگیاں ہیں۔ کڑھائی والی پھلکاری ہزارہ، سندھ، بلوچستان اور بہاولپور کی ہے۔ گیلری کی جنوبی دیوار کی طرف شوکیس میں مٹی کے بنے ہوئے انسانی ماڈل کے ذریعے مختلف اقوام کی تہذیب، زندگی گزارنے کے طریقے اور رسم و رواج دکھائی دیتے ہیں۔ ہندومت میں پوجا کے طریقے، شادی کی رسمیں، مرنے کے بعد ارتھی کا جلوس، دیہی منظر اور لوگوں کی سرگرمیاں، مختلف پیشوں سے منسلک افراد مثلاً دھوبی، بڑھئی، جمعدار، جولاہا، رنگ ساز، کسان اور مزدوروں کے ننھے منے ماڈل کے ذریعے نمائندگی کی گئی ہے۔ وضو سے لے کر نماز تک مختلف حالتیں یعنی قیام، رکوع، سجدہ، دعا کرتے ہوئے ماڈلز کو دکھایا گیا ہے۔ ایک شوکیس میں رکھے مٹی کے بنے ہوئے پھل اور سبزیاں نیشنل کالج آف آرٹس کے طالب علموں نے تیار کیے ہیں۔

☆.....☆.....☆

طنز و مزاح ابن صحرا

کافی ہاؤس

عمدہ کافی بنانا بھی کیمیا گری سے کم نہیں۔ یہ اسلئے کہہ رہا ہوں کہ دونوں کے متعلق یہی سننے میں آیا ہے کہ بس ایک انچ کی کسر رہ گئی ہے۔ ہر ایک کافی ہاؤس اور خاندان کا مخصوص نسخہ ہوتا ہے۔ جو سینہ بہ سینہ حلق بہ حلق منتقل ہوتا رہتا ہے۔ مشرقی افریقہ کے اس انگریز افسر کا تو نسخہ تو سبھی کو معلوم ہے کے جس کی مزے دار کافی کی ساری ضلع میں دھوم تھی۔ ایک دن اس نے ایک نہایت پر تکلف دعوت کی جس میں اس کے حبشی خانسامہ نے نہایت خوش ذائقہ کافی بنائی انگریز نے بہ نظر حوصلہ اس کو مہمانوں کے سامنے طلب کیا اور کافی بنانے کی ترکیب پوچھی۔ حبشی نے جواب دیا: بہت ہی سہل طریقہ ہے میں بہت سا کھولتا ہوا پانی اور دودھ لیتا ہوں پھر اس میں کافی ملا کر گرم کر دیتا ہوں۔ لیکن اسے حل کیسے کرتے ہیں بہت مہین چھنی ہوتی ہے۔ حضور کے موزے میں چھانتا ہوں۔ کیا مطلب؟ کیا تم میرے قیمتی ریشمی موزے استعمال کرتے ہو؟۔ آقا نے غضبناک ہو کر پوچھا۔ خانسامہ سہم گیا ''نہیں سرکار میں آپ کے صاف موزے کبھی استعمال نہیں کرتا۔

(مشتاق احمد یوسفی کی کتاب ''چراغ تلے'' سے اقتباس)

تیز رفتاری: میں ہسپتال میں کوئی ہفتہ بھر رہا۔ دوست احباب آتے اور جاتے رہے جو با تکلف تھے وہ آم خوبانی گرما آلو بخارا کوئی موسمی پھل لے آتے اور جو بے تکلف تھے وہ آ کر یہ سارا مال، چٹ کر جاتے تھے۔ سب ملاقاتی چلے جاتے اور ڈاکٹر صاحب راؤنڈ پر آتے تو میرے بستر کے پاس پڑی ہوئی ردّی کی ٹوکری کو لبالب دیکھتے پھر میرے چہرے کی طرف دیکھتے اور کہتے ''ماشاءاللہ صحت یابی کی رفتار کافی تیز ہے۔''

(صدیق سالک کی کتاب سیلوٹ سے اقتباس)

قائداعظم محمد علی جناحؒ اور مختلف مشاہیر کرام

اے آر خان

کسی بھی شخص کی شخصیت جاننے کے لئے اس کے کارہائے نمایاں کو مدنظر رکھا جاتا ہے۔ قائداعظم محمد علی جناح نے برصغیر کی سیاست میں سیاسی کارناموں کی وجہ سے نمایاں مقام حاصل کیا۔ ان کی شخصیت کا جائزہ لینے سے قبل یہ ضروری ہے کہ قائداعظم محمد علی جناحؒ کے دور کے مختلف نامور افراد کی آراء کا مطالعہ کیا جائے تو اس سے آپ کی شخصیت مزید نکھر کر سامنے آئے گی۔

جان کنتھر: مسٹر جناح کی زبان سحر انگیزی پر مشتمل تھی۔ پاکستان ہمارا ہے۔ دین اسلام پر نثار ہو جائیں گے۔ قائد کی زبان سے جب ادا ہوتے ہیں تو دس کروڑ مسلمان ہند فلک شگاف نعرے بلند کرتے اور پاکستان زندہ باد کے نعرے لگاتے۔

جگت نرائن لال: وہ کسی بھی طاقت کے آگے جھکنا نہیں جانتے تھے انہوں نے ہر محاذ پر انگریزوں اور ہندوؤں کو شکست دی۔

سر تیج بہادر سپرو: حصول پاکستان قائداعظم کا ایسا روشن کارنامہ ہے۔ جو رہتی دنیا تک یادگار رہے گا۔

لوئی فشر: مسٹر جناح ایک ذہین پارلیمانی شخصیت ایک ہوشیار نقاد اور ایک بے لوث سیاستدان ہیں۔

مسولینی۔ (سابق سربراہ اٹلی) قائداعظم کے لئے یہ بات کہنا غلط نہ ہوگا۔ کہ وہ ایک ایسی تاریخ ساز شخصیت ہیں جو کہیں صدیوں میں جا کر پیدا ہوتی ہیں۔ لارڈ سٹرابولگی۔ قائداعظم نے صحیح قیادت دے کر واشنگٹن، گیری بالڈوگ، اور بسمارک سے بھی بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔ پاکستان ایک بڑی قوم کا بڑا ملک ہے۔

ڈاکٹر سلطان شہر یار (سابق وزیراعظم انڈونیشیا): مسٹر جناح بہت پُر کشش آدمی ہیں۔ ایک مقناطیسی شخصیت، مسٹر جناح کی جس چیز نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا ہے وہ ان کی خود اعتمادی اور صاف گوئی ہے۔ وہ اپنے مدعا کے مکمل و مؤثر اظہار پر ساحرانہ قدرت رکھتے ہیں۔

خالدہ ادیب خانم: قائداعظم مسلمانوں کے عظیم لیڈر تھے۔ قدرت نے انہیں قیادت ہی کے لئے پیدا کیا ہے۔

ڈاکٹر ماہ پارنوالی (ایران): فکر قائد کی روشنی سے عالم اسلام کو فائدہ پہنچا ہے۔ انہوں نے قوم کے مستقبل کے لئے اپنا آج کل کے لئے قربان کر دیا اور اس وصف کے مدنظر، وہ تاریخ پاکستان کا ایک درخشاں باب متصور ہونگے۔

آقائے رزم آرا (سابق وزیراعظم ایران) قائداعظم اتحاد، یقین محکم اور تنظیم کے اصول کے مجسمہ تھے۔ انہوں نے ملت پر ان تین صفات کی اہمیت واضح کی۔ آپ ملت کے جذبہ عمل کے سرچشمہ تھے۔ ان کی تعلیمات واضح محکم اور اصول پر مبنی تھیں۔ آپ نے اپنے پیروؤں کو سیاست اور حکومت کے فن کی ایسی تربیت دی۔ کہ ان کی وفات پر پاکستان کو ضعف نہیں پہنچا۔

مسز اینی بسنت۔ جناح جیسی شخصیت بنی نوع انسان کی آزادی کے گلے کا ہار ہے۔ جس کی یاد ہمیشہ تازہ رہے گی۔

ڈاکٹر سی آر داس۔ مسٹر جناح صرف مسلمانوں کی نجی دولت نہیں ہیں۔ بلکہ وہ سارے ہندوستان کے لئے سرمایہ افتخار ہیں۔

لارڈ ایٹلی (سابق وزیراعظم برطانیہ): قائداعظم کا بے مثل جذبہ حریت اور شبانہ روز محنت ہی وہ سرمایہ ہے جس نے پاکستان جیسے ملک کی بنیاد ڈلوائی۔

نواب وقار الملک: قائداعظم محمد علی جناحؒ کسی بھی بے اصولی کو برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ بے اصولی ان کی چڑ تھی۔ اور اصول ان کی خوشنودی۔ ہمیشہ ایسے لوگوں کو پسند کرتے تھے جو اصول کے پابند ہوں خواہ ان کا تعلق کسی بھی طبقے سے کیوں نہ ہو۔

سر راس مسعود: وہ آزادی کی خاطر انگریزوں سے نبرد آزما ہوئے۔ وہ آزادی کی مہم میں کسی طرح بھی غاصبانہ اقدامات کو برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ مسلمانوں کی ذہنی معاشرتی، سیاسی اور ثقافتی روایات کو کسی قیمت پر قربان کرنا انہیں گوارا نہ تھا۔

مولانا محمد علی جوہرؒ: کاش خداوند عالم جناح کے دل میں ڈال دے کہ مسلمانوں کی راہنمائی اب اس کے سوا کوئی نہ کر سکے گا۔

نواب محمد یار جنگ: قائداعظم پاکستان کی رُوح رواں تھے۔ان کی تقریروں سے مسلمانوں کے بجھے ہوئے دلوں میں امید کی کرن پیدا ہو گئی۔ان کے پژمردہ دلوں پرامید کی کرنیں اور مسکراہٹیں رقصاں ہوگئیں اور اپنے دلوں میں ایک نیا عزم لئے جوق در جوق مسلم لیگ کے جھنڈے تلے جمع ہوگئے۔جواس بات کا ثبوت ہے کہ عوام انہیں دل وجان سے چاہتے تھے۔

حسین شہید سہروردی (وزیراعظم پاکستان): مسٹر جناح ان لوگوں میں سے ہیں جو ذاتی مقاصد کو لے کر آگے نہیں بڑھتے وہ بڑے دیانتدار اور راست گو ہیں۔وہ اپنا جواب آپ ہیں۔

مولوی عبدالحق۔ قائداعظم مرے نہیں۔وہ زندہ ہیں اور پاکستان کی شکل میں ہمیشہ زندہ رہیں گے۔

سرعبدالقادر: قائداعظم مرے نہیں۔جو مشعل راہ انہوں نے فروزاں کی تھی بدستور فروزاں ہے۔وہ پاکستان کی شکل میں زندہ ہیں اور زندہ رہیں گے۔

حکیم اجمل خان ۔ مسٹر جناح عملی طور پر وطن پرست ہیں۔اگر ایک طرف ان کا وہ جوش اور ولولہ، کہ ملک سیاسی طور پر آزاد ہوجائے اسے کسی کے سامنے سرنگوں ہونے نہیں دیتا تو دوسری طرف وہ سیاسی حالات سے بے خبر نہیں ہیں اور وہ ہر فرقے کے ساتھ انصاف چاہتے ہیں اور اسی بنیاد پر ملک کی سیاسی تعمیر کے متمنی ہیں۔

علامہ عنایت اللہ المشرقی: قائداعظم کا عزم پائندہ اور محکم تھا۔وہ ایک جری اور بے باک سپاہی تھے۔جو مخالفوں سے ٹکرانے کو کوئی باک محسوس نہیں کرتے تھے۔

مولانا ابوالکلام آزاد: قائداعظم بے جا جذباتیت کو پسند نہیں کرتے تھے۔وہ ہر مسئلے کا ٹھنڈے دل سے جائزہ لیتے تھے۔اور یہی ان کی کامیابی کا سب سے بڑا راز تھا۔

شیخ عبداللہ: قائداعظم کو اپنے مقصد میں جو اس قدر محیرالعقول کامیابی حاصل ہوئی۔اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک سچے مسلمان ہیں۔انہوں نے قوم کے مفاد کی حفاظت کا فریضہ تندرستی سے انجام دیا۔وہ ہمیشہ انصاف و دیانت کے مسلک پر کاربند رہے۔

سلطان سرمحمد شاہ آغا خان: مجھے اپنی زندگی میں بے شمار سیاستدانوں سے واسطہ پڑا۔لائیڈ جارج، چرچل، کرزن، مسولینی، گاندھی۔لیکن جناح ان سب میں منفرد تھے۔میرے خیال میں کوئی شخص بھی زیادہ مضبوط سیرت و کردار کا مالک نہ تھا ہوش وتدبر، عزیمت واستقامت جو سیاست کا سنگ بنیاد ہیں۔جناح میں بدرجہ اتم ہیں۔

چودھری رحمت علی: قائداعظم کی شخصیت بہت ہی غیر معمولی صفات کا مجموعہ تھی۔وہ ایک فلسفی کی طرح سوچتے ایک منطقی کی طرح گفتگو کرتے اور ایک ماہر قانون کی طرح پابند تھے۔

مولانا حسرت موہانی: جناح ایک لیڈر ہیں۔جو مسلمانوں کو ایک پلیٹ فارم پر لانے میں کامیاب ہوئے۔موصوف صحیح معنوں میں قائداعظم کہلانے کے حقدار ہیں۔ان کی تاریخ پیدائش وہی ہے۔جو انسانیت کے عظیم المرتبت نجات دہندہ حضرت عیسیٰ کی ہے۔اسی کی برکت ہے کہ وہ مسلمانان ہند کے سیاسی مسیحا ہیں۔

سرسکندر حیات: قائداعظم نے مسلمانوں کے لئے جو کچھ کیا ہے وہ انہیں صحیح معنوں میں قائداعظم کے لقب کا مستحق بناتا ہے۔ان کے بدترین ناقد بھی ان کی عظیم صلاحیت، اخلاص اور احساس فرض کا اعتراف کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔

علامہ ڈاکٹر سرمحمد اقبال: ہندوستان میں بحیثیت مسلمان آپ ہی کی واحد ہستی ہے جس سے ملت کو یہ توقع وابستہ کرنے کا حق ہے کہ شمالی مغربی یا شاید پورے ہندوستان میں جو سیلاب آرہا ہے اس میں آپ ملت کی صحیح راہنمائی فرمائیں گے۔

محترمہ فاطمہ جناح: قائداعظم گھریلو زندگی میں ہر وقت ہنسنے ہنسانے کے موڈ میں ہوتے باہر سخت طبیعت مگر حقیقت میں نرم طبیعت انسان تھے۔قائداعظم ایک ایسے صاحب بصیرت۔فرض شناس اور دیانت دار شخص تھے جن کا نام بطور مثال پیش کیا جاتا ہے۔تحریک پاکستان کے دوران مسلمانوں میں جو سیاسی تصور فکر اسلامی اور جذبہ حریت کا طوفان اُمڈ رہا تھا وہ قائداعظم کی جلیل اور عظیم ہستی کے طفیل تھا یہ قائداعظم کی قیادت کا ہی نتیجہ تھا کہ مسلمانوں نے ہندوؤں اور انگریزوں کی مشترکہ مخالفت کے باوجود پاکستان حاصل کیا۔قائداعظم کی دیانت کے معترف ان کے دوست تو کیا دشمن بھی تھے۔

سروجنی نائیڈو (بلبل ہند): میں بڑی مدت سے محمد علی جناح کو چاہتی ہوں۔شروع شروع میں، میں نے ان کو روکا کہ سیاست ایک گندہ کھیل ہے، اس میں نہ کودیں، لیکن اب وہ سیاست کے سمندر میں کود پڑے ہیں تو میں ان

کے لئے دعا گو ہوں۔ کہ وہ کامیابی سے ہمکنار ہوں۔ اور بھگوان انہیں سرخرو کر دے۔ آپ ایسے لیڈر ہیں۔ جن کو نہ خریدا جا سکتا ہے اور نہ بد دیانتی پر آمادہ کیا جا سکتا ہے۔

مسٹر ٹرومین (سابق صدر امریکہ)۔ دولت پاکستان کے معمار دنیا میں سب سے بڑی اسلامی مملکت کا بانی حق بات کہنے اور منوانے والا اب اس دنیا میں دوبارہ نہیں آئے گا۔

ماسٹر تارا سنگھ: قائد اعظم نے مسلمانوں کو ہندوؤں کی غلامی سے بچا لیا۔ خان لیاقت علی خاں۔ قائد اعظم نے واقعات کی رفتار اور زمانے کی روش کو اپنی غیر معمولی ذہانت اور لازوال قومی درد سے آشنا ہو کر اس کو تبدیل کرنے میں شب و روز محنت کی اور ایک منتشر قوم کو یکجا کرنے میں کامیابی حاصل کی۔

سی راجکو پال اچاریہ: قائد اعظم بلند پایہ شخصیت ہیں یہ کوئی معمولی انسان نہیں۔ ملک میں زبردست مقبولیت کے مالک ہیں۔ ان کی اندھی پیروی کی جا رہی ہے۔ یہی صحیح صحیح اور یہی سچی پیروی ہے۔ وہ اپنی قوم کو بچانا چاہتے تھے۔ وہ اس مقصد میں کامیاب ہو گئے اور انہوں نے ایک نئی مملکت قائم کر لی۔

لارڈ رسل (فلاسفر): میں تمام زندگی میں جس شخص سے زیادہ متاثر ہوا ہوں وہ محمد علی جناح کی ذات ہے۔

سر ہومی مودی۔ مسٹر جناح مدتوں سے ہماری زندگی کے ایک مہتم بالشان نمائندہ ہیں۔ ان کی روش بظاہر مجموعہ اضداد رہ چکی ہے۔ لیکن ہر تغیر کے ساتھ وہ ایک مستقل اور بنیادی اصول پر جمے رہے۔ وہ نڈر ہیں۔ بے خوف ہیں صاف گو ہیں شہرت کے طلب گار نہیں۔ اور سیاسی سازشوں سے بالکل الگ تھلگ۔ بہت کم ہیں جنہوں نے انہیں پہچانا، اور بہت کم ہیں۔ جنہوں نے ان کے تنہائی کے قلعے میں رہائی پائی۔ ایک شخصیت جو دلوں کو موہ لیتی ہے تم اس کو چاہے ناپسند کرو چاہے اسے بُرا کہو مگر اس سے بے نیاز نہیں رہ سکتے۔

پی اٹکس لارنس (انگریز صحافی) ان کا ہر ارادہ مسلمانوں کے لئے حرف آخر کی حیثیت رکھتا ہے۔ ان کا حکم مسلمانوں کے لئے آخری فیصلہ ہے۔ جس کی انتہائی خلوص کے ساتھ لفظ بلفظ تعمیل کی جاتی ہے۔

دیوان چمن لال (ایڈووکیٹ جنرل بمبئی ہائیکورٹ) جناح ان لوگوں میں سے ہے جو ذاتی مقاصد و اغراض کو پیش نظر رکھ کر نہیں بڑھتے۔ ان کی دیانت پر کسی طرح حرف گیری نہیں کی جا سکتی۔ وہ اپنی مثال آپ ہیں۔

سر کاؤس جی جہانگیر۔ جس راستہ کو وہ صداقت، حقانیت اور انصاف کا راستہ سمجھ لیتے ہیں۔ اس سے کوئی چیز بھی انہیں منحرف نہیں کر سکتی۔ وہ ہمت و استقلال کے دھنی ہیں۔ میں جرات کے ساتھ کہہ سکتا ہوں۔ کہ ان پر کسی بھی وقت کوئی موقع پرستی اور ابن الوقتی کا الزام نہیں لگا سکتا۔ انہوں نے کبھی اپنی غرض اور اپنے مفاد کو ملکی مفاد پر ترجیح نہیں دی۔

مسٹر جو کم الوا (ایڈیٹر فورم) جناح کی جرأت اور بے ساختگی نے عدالتوں میں ان کی شخصیت کو ہی اجاگر کیا ہے۔ ان کی مقناطیسی کا شہرہ ججوں سے بے خوف مقابلے اور عدالتوں میں بے لاگ قانونی موشگافیوں کے باعث دنیا بھر میں ہے۔ جناح ہماری قانون دان برادری کا سب سے زیادہ باہمت انسان ہے۔ کوئی منصف یا جج انہیں چکر دینے میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔

ایف ای جیمز (سابق لیڈر یورپین گروپ سنٹرل لیجسلیٹو اسمبلی) سیاسی مجاہد کی حیثیت سے ہندوستان میں ان کا کوئی مدمقابل نہیں۔ وہ عوام الناس کے بے خوف اور ناقابل تسخیر راہنما تھے۔

مولوی فضل حق۔ اعلیٰ کردار اور استقامت، قائد اعظم کے بڑے ہتھیار تھے۔ ان کا دل اسلام اور مسلمانوں کی محبت سے معمور تھا۔

سر سی پی راما سوامی آئر: میں جناح کے واضح نظریات اور پبلک معاملات میں ان کی بھی بے غرضی اور بے لوثی کا معترف رہا ہوں۔ انہوں نے عوام میں اپنی مقبولیت کو اپنی ذاتی فوائد کے لئے استعمال کرنے سے احتراز کیا ہے۔

ڈاکٹر امبیدکر (ہندوستان کے آئین ساز) جناح صاحب کے بڑے بڑے دشمنوں کو بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ وہ کسی بھی قیمت پر خریدے نہیں جا سکتے۔ یہ اور بات ہے کہ مسٹر جناح اپنے ارادوں میں پختہ اپنی رائے میں سخت ہیں۔ لیکن ان کے رویہ میں کبھی کوئی لوچ نہیں پایا جاتا۔

جواہر لال نہرو (سابق بھارتی وزیر اعظم) میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں۔ کہ محمد علی جناح کسی قیمت پر خریدے نہیں جا سکتے۔

ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی۔ اتنی بلند شخصیت تھے جتنی امام ابن تیمیہؒ تھے اس لئے کہ ابن تیمیہؒ نے مسلمانوں کو تاتاریوں سے بچایا۔ جبکہ قائد اعظم نے مسلمانوں کو ہندوؤں کی چیرہ دستیوں سے محفوظ کیا۔

گاندھی جی۔میں نے قائداعظم کی تقریر سے اندازہ لگایا ہے کہ انہیں ہندوؤں سے کوئی پُرخاش نہیں ہے۔وہ ان کے ساتھ پُرامن زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں۔میں جانتا ہوں کہ آپ کو مسلم عوام پر بے نظیر قابو حاصل ہے۔آپ سیرت وکردار کی ان بلندیوں پر ہیں کہ کوئی لالچ،کوئی خوف اور کوئی طعنہ آپ کو اپنی رائے سے نہیں ہٹا سکتا۔

لارڈ ماؤنٹ بیٹن: راست بازی میں یکتا،اندر باہر یکساں،انگریزی زبان کا درجہ اوّل مقرر،کمزور جسم وجاں کے ساتھ،بارُعب شخصیت،مسلمانان ہند کی اکیلے ناؤ کھینچنے والا اتنا بلند کردار اور قومی لیڈر شاید ہی مسلمانوں میں دوبارہ پیدا ہو۔

سرونسٹن چرچل (سابق برطانوی وزیراعظم) قائداعظم کو ایک بہترین سیاستدان اور دنیا کا ذہین وفطین لیڈر قرار دیا۔

لارڈ کرپس۔مسٹر محمد علی جناح کے سینے میں شیر کا دل ہے۔ان کے ارادے اٹل ہیں۔وہ ضرور ہندوستان تقسیم کروائیں گے۔

لارڈ ویول (سابق وائسرائے ہند) مسٹر جناح اپنے ارادوں میں اپنی رائے میں بے حد سخت ہیں۔ان کے رویے میں کوئی لچک نہیں پائی جاتی۔وہ مسلم قوم کے مخلص راہنما ہی نہیں بلکہ سچے وکیل بھی ہیں۔

سرشاب موکھم چٹی (انڈین لیجسلیٹو اسمبلی) وہ بلا شبہ ایک بڑے وطن پرست پارلیمانی آداب کے ماہر اور ہندوستان کی زبردست شخصیت ہیں۔جنہیں کسی ترغیب یا تحریص سے گمراہ نہیں کیا جاسکتا۔اور نہ ان کی خودداری اور آزادی چھینی جاسکتی ہے۔ان کی زبردست سیاسی شخصیت کا راز اسی اہل اور غیر فانی روح آزادی میں پوشیدہ ہے۔

وجے لکشمی پنڈت۔جناح ناقابل شکست تھے۔اگر مسلم لیگ کے پاس سو گاندھی ہوتے تو کانگرس کے پاس صرف ایک جناح ہوتا تو پاکستان کبھی نہ بنتا۔

لارڈ نسلتھگو: مسٹر جناح کے تمام الفاظ ہیروں کی طرح قیمتی،ارادے چٹان کی طرح مضبوط وہ حقیقت میں ناقابل تسخیر ہیں۔

نیلسن (جرنیل اور مدبر) مسٹر محمد علی جناح میں قدرت نے بے پناہ صلاحیتیں دی ہیں جب چاہیں جنگ کا رُخ تبدیل کر سکتے ہیں۔دس کروڑ انسان ان کے کہنے پر اپنی جان قربان کر سکتے ہیں۔

***

مائیں کتنی سادہ ہوتی ہیں

ثقلین مبارک

یہ ہمیشہ پرانے زمانے میں زندہ رہتی ہیں،انہیں لگتا ہے کہ ان کی اولاد دنیا کی معصوم ترین اولاد ہے۔انہیں ہر وقت یہ خطرہ رہتا ہے کہ ان کا بچہ ہمیشہ بچہ ہی رہے گا اور دنیا کی چالاکیوں سے ناواقف رہے گا۔یہ دنیا کے ہر مسئلے کا حل دعاؤں کو قرار دیتی ہیں اور حیرت انگیز طور پر ان کی دعائیں رنگ بھی لے آتی ہیں۔ان کی اکثریت موبائل فون استعمال کرنا نہیں جانتی،ٹی وی آن کرنا نہیں جانتی،بڑی بڑی باتیں نہیں سمجھتی،دلائل سے بات نہیں کرسکتی،فیس بک کے بارے میں نہیں جانتی،ٹوئٹر سے انجان ہے،سادہ زندگی گذارتی ہے،کسی بھی بات کو سچ سمجھ لیتی ہے،بڑی جلدی گھبرا جاتی ہے،چھوٹی چھوٹی باتوں پر سہم جاتی ہے،لڑائی سے گھبراتی ہے۔ہم میں سے شائد کسی کو نہ پتا ہو کہ ہماری ماں کون سا کھانا بہت شوق سے کھاتی ہے؟اس کی پسند کیا ہے؟ہم یہ بھی نہیں جانتے کہ ماں کو کس رنگ کا سوٹ پسند ہے،پسندیدہ سویٹ ڈش کون سی ہے؟آپ نے کبھی اپنی ماں کو کسی چیز کے لیے للچاتے ہوئے نہیں دیکھا ہوگا،ہم میں سے اکثریت کا تعلق غریب خاندانوں سے ہے،یاد کیجئے اپنے بچپن کے وہ دن جب آپ پیٹ بھر کر کھانا کھاتے تھے اور ماں ہمیشہ ہانڈی پونچھ پونچھ کر پیٹ بھرتی تھی۔یہ وہ ماں ہے جو بچے کے ہاتھ دھلواتے وقت صابن تھوڑا لگاتی ہے۔اور کلمہ طیبہ زیادہ پڑھتی ہے۔ہم میں سے کتنے لوگوں کو یاد ہے کہ ان کی ماں کو جب بے وقت بھوک لگتی ہے تو وہ کیا کھاتی ہے؟کیا آپ نے کبھی اِس پرانی ماں کو برگر یا پیزے کے لیے مچلتے دیکھا ہے؟اسے جو بھی دے دیا جائے یہ صبر شکر کر کے کھا لیتی ہے،یہ سخت بیمار بھی ہو تو اسے بچوں کی فکر کھائے جاتی ہے،یہ ڈاکٹر کے پاس جائے بغیر خود ہی ٹھیک ہو جاتی ہے،یہ اتنی سادہ ہوتی ہے کہ اپنے جہیز کی چیزیں بھی یہ سوچ کر پیٹی میں رکھ دیتی ہے کہ بیٹی کے کام آئیں گی۔ہمیں ایسا ہی لگتا ہے جیسے ہماری ماں بس شروع سے ہی ایسی تھی،نہیں۔۔۔یہ ماں بھی کبھی نوجوان تھی،اس کی بھی کچھ خواہشیں،کچھ اُمنگیں تھیں،لیکن ماں بنتے ہی اس نے اپنے سارے جذبے،سارے شوق دفن کر لیے۔اور صرف اولاد کی ہی ہو کر رہ گئی۔اللہ پاک سب کی ماؤں کو زندہ سلامت رکھیں۔آمین ثم آمین

پاکستان کا قومی ہیرو جنرل اختر حسین ملک (ہلال جرأت)

رانا عبدالرزاق خان

اختر حسین ملک یکم اگست ۱۹۱۷ء کو اٹک (سابقہ نام کیمبلپور) کے ایک گاؤں پنڈوری میں پیدا ہوئے۔ گورنمنٹ کالج کیمبلپور کے بعد پنجاب یونیورسٹی سے گریجویشن کے بعد ۱۹۴۱ء میں انڈین ملٹری اکیڈمی ڈیرہ دون میں تربیت کا آغاز کیا۔جس کی تکمیل پر مسلح افواج میں کمیشن حاصل کیا۔دوسری جنگ عظیم میں اختر حسین ملک نے برما کے محاذ پر جنگی خدمات انجام دیں۔اس کے صلے میں آپ کو'' برما سٹار'' کا اعزاز دیا گیا۔قیام پاکستان سے قبل آپ کا تقرر جی ایچ کیو انڈیا میں تھا۔پھر پاکستان میں ان کو لیفٹیننٹ کرنل کے عہدے پر ترقی دے دی گئی۔اور ایک انفنٹری بٹالین کے کمانڈر بنائے گئے۔۱۹۵۶ء میں بریگیڈیئر کے عہدے پر ترقی ملی۔اور ڈپٹی کمانڈنٹ سٹاف کالج کوئٹہ کی ذمہ داری سونپی گئی۔ازاں بعد آپ نے کمانڈنٹ انفنٹری سکول کے طور پر خدمات انجام دیں۔

۱۹۵۹ء میں انفنٹری بریگیڈ کی کمان سنبھالی۔جس کے بعد جی ایچ کیو میں ڈائریکٹر انفنٹری مقرر ہوئے۔ترقی کی منازل اسی طرح طے کرتے ہوئے میجر جنرل اور لیفٹیننٹ جنرل کے مقام تک پہنچے۔لیفٹیننٹ جنرل اختر حسین ملک کی تمام زندگی ایک شیر کی سی زندگی تھی۔لیکن آپ کا اس سے بڑا کارنامہ چھمب اور جوڑیاں (کشمیر) کی فتح تھا۔وہ پہلے جنرل تھے کہ جن کو ۱۹۶۵ء کی جنگ میں جرأت و استقلال کا عظیم کارنامہ انجام دینے پر ہلال جرات دیا گیا۔۱۹۶۵ء میں آپ کو یہ ذمہ داری دی گئی تھی کہ بھمبر کے علاقے میں کشمیر کی سرحد پر بھارت کی جارحانہ کاروائیوں کو سبوتاژ کریں۔ چھمب کے اس محاذ پر بھارت نے اپنی مضبوط فوجی چوکیاں قائم کر رکھی تھیں۔دشمن کی فوج بھی تعداد اور ہتھیاروں کے لحاظ سے کئی گنا طاقتور تھی۔خیال تھا کہ فوج کے جس حصے کی کمان جنرل اختر حسین ملک کے ہاتھ میں تھی۔وہ اس تعداد میں بے حد کم اور کمزور تھا۔اس کے باوجود جنرل اختر حسین ملک نے آگے بڑھ کر اس جرأت سے حملہ کیا کہ دشمن کے تمام مورچے تباہ ہو کر رہ گئے۔اس کامیابی کا مرکزی کریڈٹ جنرل اختر حسین ملک کو ملا۔کیونکہ وہ گھمسان کی لڑائی کے دوران اگلی صفوں میں جا کر مجاہدوں کا حوصلہ بڑھاتے رہے۔اور پلان اس حکمت عملی سے ترتیب اور انجام دیا کہ دشمن کو عبرتناک شکست سے دوچار ہونا پڑا۔ چنانچہ آپ کی اسی جرأت اور شجاعت کا ذکر کرتے ہوئے پاکستان کے مشہور دانشور اور شاعر و ادیب جناب احمد ندیم قاسمی نے لکھا:۔

''لیفٹیننٹ جنرل اختر حسین ملک، ملک و قوم کے ایسے ہیرو تھے کہ جن کا نام پاکستانی بچوں کو بھی یاد ہے۔جب ان کی سرکردگی اور نگرانی میں پاکستانی افواج چھمب اور جوڑیاں کے آہنی مورچوں کو مسمار کرتے ہوئے جموں کی طرف بڑھ رہی تھیں تو لیفٹیننٹ جنرل اختر حسین ملک پاکستانیوں کی بہادری اور استقامت اور اولوالعزمی کی ایک مجسم تصویر بن کر اُبھرے۔اور اہل پاکستان کے ذہنوں پر چھا گئے۔'' (روزنامہ جنگ کراچی ۹ ستمبر ۱۹۶۹ ص ۴)

اخبار خواتین کراچی نے جنرل اختر حسین ملک کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے لکھا۔

''یہ اگست کا مہینہ اور ۱۹۶۵ کا سال ہے۔ٹیٹوال سیکٹر میں ہندوستانی فوج کی سنگین خلاف ورزیوں کا سلسلہ جاری ہے۔دشمن کی فوجیں درّہ حاجی

کی طرف پیش قدمی کر رہی ہیں۔ پاکستانی افواج نے اپنی مدافعت کے لئے جوابی کاروائی کا ارادہ کیا ہے۔ کہ اب اس کے بغیر کوئی چارہ نہیں۔ یہی وقت تھا، جب پاکستانی افواج کی کمان جنرل اختر حسین ملک کے سپرد ہوئی۔ چھمب کے اس معرکہ میں ہندوستانی بریگیڈ کو ذلت آمیز شکست ہوئی۔ اور اس کا خاصا جانی و مالی نقصان ہوا۔ جوڑیاں اور چھمب کی یہ شکست ہندوستان پر قیامت بن کر ٹوٹی۔ یہاں ہندوستانی فوج، مسلسل کمک کے باوجود جنگی برتری حاصل نہ کر سکی۔ اور بالآخر اسے پسپا ہونا پڑا۔''

(اخبار خواتین کراچی ۱۲ ستمبر ۱۹۶۹ء ص ۲۴)

یہ امر باعث حیرت ہے کہ چھمب جوڑیاں کے معرکے سر کرنے والے اس شیر دل جرنیل کو دوران جنگ ہی محاذ سے بلا کر جی ایچ کیو میں بطور ڈائریکٹر جنرل ملٹری ٹریننگ کی ذمہ داری سونپ دی گئی۔ بعد ازاں اسٹاف کالج کوئٹہ کا کمانڈنٹ بالآخر سیٹو (میثاق وسطیٰ) میں نمائندگی کے لئے انقرہ بھیج دیا گیا۔ ترکی میں قیام کے دوران ہی ۲۲ اگست ۱۹۶۹ء کو آپ اور آپ کی اہلیہ محترمہ کار کے حادثے میں جاں بحق ہو گئے۔ آپ کی میت ۲۶ اگست ۱۹۶۹ء کو پورے فوجی اعزاز کے ساتھ چکلالہ ائیر پورٹ راولپنڈی پر اتاری گئی۔ ہوائی اڈے پر میت لینے کے لئے موجود افراد میں اس وقت کے سی این سی، پاک بحریہ کے کمانڈر انچیف، پاک فضائیہ کے کمانڈر انچیف اور دیگر اعلیٰ فوجی وسول حکام شامل تھے۔ صدر پاکستان کی نمائندگی ان کے ملٹری سیکٹری نے کی۔ میت کے ہمراہ سیٹو کے ملٹری ڈپٹیز کے چیئرمین، چیف آف ٹرکش جنرل سٹاف کے نمائندے لیفٹیننٹ جنرل الپکایا بھی آئے۔ جنرل الپکایا نے اس موقع پر تعزیتی تقریر میں کہا ''مرحوم اعلیٰ پایہ کے جنرل تھے اور نہ صرف پاکستان میں بلکہ دوسرے برادر ممالک میں ان کا نام بڑی عزت سے لیا جاتا تھا۔''

(روزنامہ جنگ کراچی ۲۶ اگست ۱۹۶۹ء)

اس موقع پر سی این سی جنرل عبدالحمید خاں نے کہا:۔

''لیفٹیننٹ جنرل اختر حسین ملک ایک عظیم سپاہی، ایک عمدہ کمانڈر، بہترین منصف اور شریف النفس انسان تھے''۔

(روزنامہ نوائے وقت ۲۶ اگست ۱۹۶۹ء)

بریگیڈیئر ریٹائرڈ شوکت قادر ۱۹۶۵ء آپریشن گرینڈ سلیم کے متعلق ۴ اکتوبر ۲۰۰۳ء کو ڈیلی ٹائمز لاہور میں لکھتے ہیں۔

'' وہ ایک دلیر اور جری کمانڈر تھے جو دباؤ میں بھی گھبراتے نہیں تھے۔ اور پُرسکون رہتے تھے اور اپنے جوانوں میں اعتماد کی جوت جگا دیتے تھے۔ نہ صرف افسروں میں بلکہ سپاہیوں میں بھی۔ جس سے لوگوں کے حوصلے بلند ہو جاتے۔ لیفٹیننٹ جنرل اختر حسین ملک اس طرح کی مہم GRANDSALAM کے لئے بہترین صلاحیتوں والے کمانڈر تھے۔ جب شروع میں اس آپریشن کی منصوبہ بندی کی گئی تو یہ بات GHQ کے علم میں تھی کہ لیفٹیننٹ جنرل اختر حسین ملک ایک حد سے زیادہ پھیلی ہوئی ڈویژن کی کمان کر رہے ہیں۔ جس پر دشمن کا بہت زیادہ دباؤ تھا۔ تاہم انھیں اس مہم جوئی GRANDSALAM کیلئے منتخب کیا گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اکثر اوقات وہ فرسٹ کور سے بھی بڑی افواج کی کمان کرتے رہے تھے۔ اس لئے حیرت کی بات ہے کہ انہیں ۱۲ ڈویژن کی کمان سے کیوں الگ کر دیا گیا''۔

(V) '' آپریشن GRANDSALAM یکم ستمبر کو صبح سویرے پانچ بجے شروع ہونا تھا۔ یہ منصوبہ بندی کے مطابق شروع ہوا۔ چھمب مقررہ وقت کے اندر سرنگوں ہو گیا اور پہلی روشنی کے جلد بعد صبح سات بجے کے قریب ہماری افواج نے دریا توی کو عبور کرنا شروع کر دیا۔ آگے کی جنگی کاروائی تیزی سے جاری رہی اور بعد دوپہر ایک بجے تک افواج نے اپنی نفری اور پوزیشن مستحکم کر لی۔ اور اب وہ اپنے مربوط خطوں میں داخل ہونے کے لئے تیار ہی کھڑی تھی۔ یہاں سے روشنی ختم ہونے سے کافی وقت پہلے قریباً ۳ بجے سہ پہر کو اکھنور پر حملے کا آغاز کیا جا سکتا تھا۔ بہر حال اکھنور تک پہنچنا ہماری قسمت میں نہ تھا (کیونکہ جنرل اختر حسین ملک اور ان کے لشکر کو روک دیا گیا) ٹوٹی کہاں کمند۔ بریگیڈیئر ریٹائرڈ شوکت قادر اپنے مضمون کے آخری حصے میں بتاتے ہیں:۔ کہ کامگار کمانڈر جنرل اختر حسین ملک کو واپس آنے کا حکم دے کر قیمتی وقت ضائع کر دیا گیا۔۔۔ اسی دوران اکھنور کو اضافی کمک دے کر مضبوط بنا لیا گیا اور وہ ہدف ناقابل حصول ہو گیا۔۔۔ شائد اگر اکھنور پر قبضہ ہو جاتا اور ہندوستان کی سپلائی لائن کاٹ دی جاتی تو ہندوستان کبھی بھی سیالکوٹ پر حملہ آور نہ ہوتا!!۔

(۴ اکتوبر ۲۰۰۳ء کو ڈیلی ٹائمز لاہور)

نوائے وقت میگزین میں ڈاکٹر شبیر احمد بعنوان جنرل اختر حسین ملک کی زبان پر آخری الفاظ تھے اکھنور، کشمیر!'' اپنے مضمون میں ۱۹۶۵ء کی جنگ کا ذکر کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں۔

۱۹۶۵ء میں جب میجر جنرل اختر حسین ملک چھمب جوڑیاں سیکٹر میں آگے بڑھتے بڑھتے اکھنور پار کرنے لگے تھے۔اور کشمیر پکے پھل کی طرح پاکستان کی جھولی میں آ گرنے والا تھا۔...فیلڈ مارشل ایوب خان صدر پاکستان تھے۔ان جیسے محب وطن صدر کو معلوم تک نہ ہوا اور محاذ کے کور کمانڈر نے عین موقع پر جنرل اختر حسین ملک جیسے جانباز کو ایک عیاش جنرل یحییٰ خان سے بدل دیا۔صاحبو! جیتی ہوئی بازی ہر گئی ۔ جنرل اختر حسین ملک کے چند سال کچھ اس طرح کا داغ لئے گزرے۔...کہتے ہیں ترکی میں جنرل اختر حسین ملک ٹریفک کے مہلک حادثے میں زخمی ہوئے تو آخری لمحات میں ان کی زبان پر دو الفاظ تھے۔''اکھنور۔کشمیر!''

(مضمون مطبوعہ نوائے وقت سنڈے میگزین مورخہ ۱۲ر جون ۲۰۰۵ء ص ۱۰ کالم ۴)

آخر پر سید ضمیر جعفری کے الفاظ میں اس قومی ہیرو اور سپوت پاکستان (ہلال جرأت) کو ہدیہ تبریک پیش ہے۔

چمکتی ہوئی توپ گاڑی پر جو تابوت ہے، چاند تارے کے پرچم میں لپٹا ہوا، ابد کی خاموشی میں کھویا ہوا ،اپنی شفاف وردی میں سویا ہوا،اک جیالا، جری، نام آور، دلاور، بہادر سپاہی، سرد پیکر میں اب دل دھڑکتا نہیں، آگ جلتی نہیں، خون چلتا نہیں، جسم بے جان ہے، لیکن اے زندگی! یہ وہ انسان ہے! اک جیالا، جری، نام آور، دلاور، بہادر سپاہی ، جو اپنے مقدس وطن، خطہ دلنشین، کشور بہترین کے لئے! اس زمیں پر بہشت بریں کے لئے! پاک پرچم تلے! وادیوں! جنگلوں! پربتوں میں لڑا! موت کے سامنے مسکراتا رہا، جنگ اور امن کے زخم کھاتا رہا، تاکہ یہ شہر گاؤں بستے رہیں، پھول کھلتے رہیں، باغ مہکے رہیں، کھیت ہنستے رہیں!

(ماہنامہ نیا زمانہ لاہور شمارہ جنوری ۲۰۰۵)

20 باؤنڈری کمیشن میں سر ظفر اللہ خان کی شاندار خدمات

ملکی تقسیم کے ساتھ پنجاب کی تقسیم کی خبر آنے پر جماعت نے اسے رکوانے کے لئے قائداعظم اور وزیراعظم برطانیہ کو تاریں دیں کہ یہ پاکستان کا حصہ بننا چاہیے کیونکہ یہاں کی اکثریت مسلمان ہیں۔ لیکن گورنمنٹ نے باؤنڈری کمیشن کا اعلان کر دیا قائداعظم نے مسلم لیگ کے وکیل کے طور پر سر ظفر اللہ خان کا انتخاب کیا ۔بہت کم وقت تھا جماعت نے اپنے خرچ پر امریکہ اور یورپ سے باؤنڈری لٹریچر اور فیصلوں کی نقلیں منگوائیں لندن کے ممتاز جغرافیہ دان پروفیسر spate کو مدد کے لئے بلوایا۔ امام جماعت احمدیہ تمام کاروائی براہ راست سننے کے لئے لاہور آ گئے اور ساتھ ساتھ سر ظفر اللہ خانصاحب کو ہدایات دیں۔ آپ نے جس قابلیت اور خوبی سے یہ کیس پیش کیا اس پر ساری قوم نے آپکو خراج تحسین پیش کیا۔ نوائے وقت (یکم اگست 47) لکھتا ہے ''جس خلوص اور قابلیت کے باعث انہوں نے اپنا فرض بڑی خوبی سے ادا کیا ہمیں یقین ہے کہ پنجاب کے سارے مسلمان بلالحاظ عقیدہ انکے اس کام کے معترف اور شکر گزار ہیں'' قائداعظم اتنے خوش ہوئے کہ آپ کو اقوام متحدہ میں پاکستان کی وفد کا قائد مقرر کر دیا۔

ایک سبق آموز کہانی

سردار فضل عمر ڈوگر

تین نوجوان ملک سے باہر سفر پر جاتے ہیں اور وہاں ایک ایسی عمارت میں ٹھہرتے ہیں جو 75 منزلہ ہے..ان کو 75 ویں منزل پر کمرہ ملتا ہے..ان کو عمارت کی انتظامیہ باخبر کرتی ہے کہ یہاں کے نظام کے مطابق رات کے 10 بجے کے بعد لفٹ کے دروازے بند کر دیے جاتے ہیں لہذا ہر صورت آپ کوشش کیجیے کہ دس بجے سے پہلے آپ کی واپسی ممکن ہو کیونکہ اگر دروازے بند ہو جائیں تو کسی بھی کوشش کے باوجود لفٹ کھلوانا ممکن نہ ہوگا..

پہلے دن وہ تینوں سیر و سیاحت کے لیے نکلتے ہیں تو رات 10 بجے سے پہلے واپس لوٹ آتے ہیں مگر دوسرے دن وہ لیٹ ہو جاتے ہیں.. اب لفٹ کے دروازے بند ہو چکے تھے..ان تینوں کو اب کوئی راہ نظر نہ آئی کہ کیسے اپنے کمرے تک پہنچا جائے جبکہ کمرہ 75 منزل پر ہے..تینوں نے فیصلہ کیا کہ سیڑھیوں کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ تو نہیں ہے تو یہاں سے ہی جانا پڑے گا..ان میں سے ایک نے کہا.." میرے پاس ایک تجویز ہے.. یہ سیڑھیاں ایسے چڑھتے ہوئے ہم سب تھک جائیں گے.. ایسا کرتے ہیں کہ اس طویل راستے میں ہم باری باری ایک دوسرے کو قصے سناتے ہوئے چلتے ہیں..25 ویں منزل تک میں کچھ قصے سناؤں گا اس کے بعد باقی 25 منزل تک دوسرا ساتھی قصے سنائے گا اور پھر آخری 25 منزل تیسرا ساتھی..اس طرح ہمیں تھکاوٹ کا زیادہ احساس نہیں ہوگا اور راستہ بھی کٹ جائے گا.." اس پر تینوں متفق ہو گئے..

پہلے دوست نے کہا..''میں تمہیں لطیفے اور مزاحیہ قصے سناتا ہوں جسے تم سب بہت انجوائے کرو گے.." اب تینوں ہنسی مذاق کرتے ہوئے چلتے رہے..جب 25 ویں منزل آ گئی تو دوسرے ساتھی نے کہا.." اب میں تمہیں قصے سناتا ہوں مگر میرے قصے سنجیدہ اور حقیقی ہونگے.." اب 25 ویں منزل تک وہ سنجیدہ اور حقیقی قصے سنتے سناتے ہوئے چلتے رہے.. جب 50 ویں منزل تک پہنچے تو تیسرے ساتھی نے کہا.." اب میں تم

لوگوں کو کچھ غمگین اور دکھ بھرے قصے سناتا ہوں۔'' جس پر پھر سب متفق ہوگئے اور غم بھرے قصے سنتے ہوئے باقی منزلیں بھی طے کرتے رہے۔ تینوں تھک کر جب دروازے تک پہنچے تو تیسرے ساتھی نے کہا۔ ''میری زندگی کا سب سے بڑا غم بھرا قصہ یہ ہے کہ ہم کمرے کی چابی نیچے استقبالیہ پر ہی چھوڑ آئے ہیں۔'' یہ سن کر تینوں پر غشی طاری ہوگئی۔ اگر دیکھا جائے تو ہم لوگ بھی اپنی زندگی کے 25 سال ہنسی مذاق کھیل کود اور لہو ولعب میں گزار دیتے ہیں۔ پھر باقی کے 25 سال شادی بچے رزق کی تلاش نوکری جیسی سنجیدہ زندگی میں پھنسے رہتے ہیں۔ اور جب اپنی زندگی کے 50 سال مکمل کر چکے ہوتے ہیں تو زندگی کے باقی آخری سال بڑھاپے کی مشکلات بیماریوں ہوسپٹلز کے چکر بچوں کے غم اور ایسی ہی ہزار مصیبتوں کے ساتھ گزارتے ہیں۔ یہاں تک کہ جب موت کے دروازے پر پہنچتے ہیں تو ہمیں یاد آتا ہے کہ ''چابی'' تو ہم ساتھ لانا ہی بھول گئے۔ رب کی رضامندی کی چابی۔ جس کے بغیر یہ سارا سفر ہی بے معنی اور پچھتاوے بھرا ہوگا۔ اس لیے اس سے پہلے کہ ہم ...کے دروازے تک پہنچیں اپنی چابی حاصل کرلیں۔

***

امریکا میں چھپائی کی ابتدا۔ شرافت علی

امریکا میں چھپائی کا کام 1630ء میں انگریزوں کے ذریعے شروع ہوا۔ ''پاسٹر جوس گلور'' اور ''اسٹیفن ڈائی'' میاس سٹس بے میں چھاپہ خانہ قائم کرنے میں کامیاب ہوئے۔ 1648ء میں انہوں نے پہلی کتاب ''بے سام'' جو مذہبی کتاب تھی شائع کی۔ 1947ء میں ان کی تاریخی کتاب کی نیلامی ایک لاکھ پچاس ہزار ڈالر میں ہوئی۔ اس پریس کی دوسری کتاب ریڈ انڈین زبان میں جان ایلیٹ کی ترجمہ کی ہوئی بائبل ہے۔ امریکا کے بہترین مطابع میں سے ایک بنجمن فرینکلن کا چھاپہ خانہ تھا۔ دوسرا چھاپہ خانہ فلاڈلفیا میں قائم کیا گیا۔ بیسویں صدی عیسوی میں امریکا میں چھپائی، کتب سازی اور کتابوں کی تجارت کو بڑی ترقی حاصل ہوئی۔ امریکا میں کتابوں کی صنعت 1690ء میں شروع ہوئی۔ لہٰذا بیشتر ناشر چھپائی کے لیے کاغذ انگلستان سے منگواتے تھے۔

☆.....☆.....☆

مؤثر افراد کے 12 راز

رضوان عطا

ذیل میں ایسی 12 خصوصیات کو بیان کیا گیا ہے جو دوسروں پر اثر انداز ہونے والے یا باسانی قائل کرنے والے افراد کی کا جزو ہوتی ہیں۔

1۔ اپنی آڈئینس کو پہچانیں: مؤثر افراد اپنی آڈئینس (مخاطب) کو داخلی اور خارجی دونوں طرح سے جانتے ہیں اور اس کی مناسبت سے وہ انہیں کی زبان میں باتیں کرتے ہیں۔ اگر کوئی شخص شرمیلا ہے تو اس سے نرم لہجے میں بات کرنی ہے اور اگر کسی کا لہجہ جارحانہ ہے تو اسے دوسرے انداز سے نپٹنا ہے۔ زندگی میں مختلف طرح کے لوگوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ مؤثر افراد اس فرق کو بخوبی سمجھتے ہیں۔ انہیں معلوم ہوتا ہے کہ ہر کسی سے ایک ہی طرح کا برتاؤ نہیں کیا جاسکتا۔ ایسا کرنے کے لیے بہت زیادہ سماجی اور شخصی جانکاری درکار ہوتی ہے جو مؤثر افراد میں بدرجہ اتم پائی جاتی ہے۔

2۔ تعلق قائم کرنا: جب کسی کو احساس ہوجائے کہ آپ کیسے انسان ہیں تو قبولیت کا درجہ بڑھ جاتا ہے۔ مذاکرات کے حوالے سے ہونے والی ایک تحقیق میں سٹینفورڈ یونیورسٹی کے طلبا سے کہا گیا کہ وہ اپنی جماعت میں کسی معاملے پر اتفاق رائے پر پہنچیں۔ ہدایات کے بغیر 55 فیصد کا اتفاق رائے ہوگیا، لیکن جب اتفاق رائے پر پہنچنے سے قبل طلبہ کو ہدایت دی گئی کہ وہ اپنا تعارف کروائیں اور اپنے پسِ منظر کے بارے میں بتائیں تو اس کے بعد 90 فیصد طلبہ اتفاق رائے پیدا کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ یہ ذہن میں رکھنا چاہیے کہ جس سے آپ بات کررہے ہیں وہ آپ کا دشمن یا ہدف نہیں ہے اور بحث میں زیادہ الجھنا بھی نہیں چاہیے، بے شک آپ کے پاس مضبوط دلائل ہی کیوں نہ ہوں۔ اگر آپ اس شخص کی سطح پر آکر اور اسے سمجھ کر تعلق اور رابطہ قائم نہیں کریں گے تو وہ آپ کی نہیں مانے گا یا آپ کے کہے کو مشکوک سمجھے گا۔

3۔ زیادہ دباؤ نہیں ڈالتے: مؤثر افراد اپنے خیالات کا اظہار اعتماد کے ساتھ اور کھل کر کرتے ہیں لیکن ایسا کرتے ہوئے وہ جارحانہ انداز اختیار نہیں کرتے یا بہت زیادہ دباؤ نہیں ڈالتے۔ مؤثر افراد اپنے مؤقف پر بہت زیادہ اصرار نہیں کرتے کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ دوسروں کے قائل ہونے میں وقت بھی لگ سکتا ہے۔ وہ بے صبرے نہیں ہوتے اور مستقل مزاج رہتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ اگر ان کے خیالات افضل ہیں تو بالآخر لوگ انہیں اختیار کرلیں

گے۔

4۔ اعتمادی کی کمی نہ ہونا: اگر اپنے خیالات کو اس انداز میں پیش کیا جائے جیسے دوسرے سے قبولیت کی سند مانگی جارہی ہے یا جیسے ان میں کوئی خامی موجود ہے تو دوسرا انہیں سنجیدگی سے نہیں لے گا۔ دوسروں کو اپنے خیالات یوں بتانے چاہئیں جیسے انہیں سوچ سمجھ کر تشکیل دیا گیا ہے۔ جب مقصد دوسرے کو قائل کرنا ہو تو اس میں آئیں بائیں شائیں نہیں چلتی، اور یہ بھی نہیں کہ ''ہوسکتا ہے میں غلط ہوں''۔

5۔ باڈی لینگوئج کو مثبت رکھیں: انداز بیاں، آواز اور جسمانی حرکات میں توازن دوسروں کو قائل کرنے میں مددگار رہتا ہے۔ گفتار میں گرم جوشی اور دوسرے پر توجہ کا اظہار مثبت باڈی لینگوئج کی علامات ہیں۔ اس سے دوسرے آپ کی جانب راغب ہوتے ہیں۔ جو آپ کہہ رہے ہیں وہ بھی اتنا اہم ہے جتنا یہ کہ آپ اسے کس انداز میں کہہ رہے ہیں۔

6۔ واضح اور جامع ہونا: مؤثر افراد اپنے خیالات کا اظہار بروقت، جلد اور واضح انداز سے کرسکتے ہیں۔ جب آپ کی اپنے خیالات اور گفتار پر گرفت مضبوط ہوتی ہے تو اسے دوسروں کے اذہان میں راسخ کرنا آسان ہوتا ہے۔ بہتر حکمت عملی یہ ہوتی ہے کہ جس موضوع پر قائل کرنا ہو اسے خود اچھی طرح سمجھ لیا جائے۔

7۔ جعل سازی نہیں ہوتے: مؤثر ہونے کے لیے ایماندار ہونا شرط ہے۔ جعل ساز کو پسند نہیں کیا جاتا۔ متاثر ہونا تو دور کی بات جعل ساز کی باتوں پر بہت کم اعتبار کیا جاتا ہے۔ مؤثر افراد جانتے ہیں کہ وہ کیا ہیں۔ ان میں مصنوعی پن نہیں ہوتا۔ وہ اپنے ہنر سے آگاہ ہوتے ہیں۔ وہ اس امر کی پروا کم کرتے ہیں کہ دوسرے انہیں کیسا دیکھنا چاہتے ہیں بلکہ اپنے بارے فیصلہ وہ خود کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ دوسروں کے لیے خود کو غیر ضروری اور غیر معمولی حد تک بدلنے کے جتن نہیں کرتے۔

8۔ دوسروں کے مؤقف کو سمجھنا: مؤثر افراد کی ایک اہم خوبی یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنی غلطی یا اپنے دلائل میں پائی جانے والی خامیوں کو مان لیتے ہیں۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ وہ کھلے ذہن کے مالک ہیں۔ وہ دوسروں کی مضبوط دلیل سے انکار نہیں کرتے اور اس معاملے میں ہٹ دھرم نہیں ہوتے۔ وہ دوسروں کو بات کرنے کا موقع دیتے ہیں اور اختلاف کرنے پر ان کا رویہ توہین آمیز نہیں ہوتا۔

9۔ اچھے سوالات پوچھنا: لوگوں کی بڑی خامی یہ ہوتی ہے کہ وہ دوسروں کی بات کو کم سنتے ہیں بلکہ اس دوران غور کرتے رہتے ہیں کہ انہوں نے کیا جواب دینا ہے۔ تاہم دوسرے چاہتے ہیں کہ ان کی بات کو غور سے سنا جائے۔ اگر انہیں یہ احساس ہو کہ دوسرا توجہ ہی نہیں دے رہا تو وہ برا ماننے کے ساتھ ساتھ دوسرے کی بات پر توجہ بھی کم کردیتے ہیں۔ یوں ان کا اثر قبول کرنے یا ان سے قائل ہونے کے امکانات کم ہوجاتے ہیں۔

10۔ تصویر کشی کرنا: مؤثر افراد اس انداز میں گفتگو کرتے ہیں کہ جس سے صورت حال کا نقشہ دوسرے کے ذہن میں بن جاتا ہے۔ وہ دوسروں کی تصوراتی صلاحیت کو بروئے کار لاتے ہیں۔

11۔ پہلا بھرپور تاثر قائم کرنا: ملاقاتوں کے دوران ابتدا میں قائم ہونے والا تاثر تادیر برقرار رہتا ہے۔ مؤثر افراد اس حقیقت پر توجہ دیتے ہیں اور اسی کی بنیاد پر دوسروں کو قائل کرنے میں کامیاب ہونے کی کوشش بھی کرتے ہیں۔ پہلی ملاقات میں چہرے پر خوشگوار مسکراہٹ کا ہونا، گرم جوش مصافحہ اور گفتار میں سلیقہ جو تاثر قائم کرتا ہے وہ دیر سے جاتا ہے۔

12۔ مستقل مزاجی: مؤثر افراد مستقل مزاج ہوتے ہیں۔ انہیں معلوم ہوتا ہے کہ کہاں اپنے مؤقف کا دفاع کرنا ہے اور کہاں قدم پیچھے ہٹانا ہے۔ لیکن وہ اپنے نصب العین سے منہ نہیں موڑتے۔ ان کی نظر راستے کی دشواریوں کے ساتھ ساتھ مسلسل اپنے حتمی مقصد پر ہوتی ہے۔

نسرین سیّد

زندگی تم سے، بندگی تم سے
دل کے آنگن میں چاندنی تم سے
میرے سُر، میری شاعری تم سے
میرے گیتوں میں نغمگی تم سے
آنکھ میں ہے تمہارا نور بسا
دل میں رہتی ہے روشنی تم سے
تم سے مل کر ہے خود کو پہچانا
بے خودی تم سے، آگہی تم سے
آنکھوں آنکھوں میں بات کہہ دینا
سیکھ لی ہم نے سادگی تم سے

مُلکِ شام کے حالات امام مہدی کا ظہور اور نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیشنگوئیاں.....!

اللہ کے رَسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قیامت کے نشانات بتلاتے ہوئے فرمایا کہ ''اُونٹوں اور بکریوں کے چَرواہے جو بَرہنہ بَدن اور ننگے پاؤں ہونگے وہ ایک دوسرے سے مقابلہ کرتے ہوئے لمبی لمبی عمارتیں بنوائیں گے اور فخر کریں گے...'' (صحیح مسلم 8)

ریاض شہر میں عمارتوں کا یہ مقابلہ آج اپنے عُروج پر پہنچ گیا، دبئی میں ''برج خلیفہ'' کی عمارت دنیا کی سب سے اُونچی عمارت بن گئی تو ساتھ ہی شہزادہ ولید بن طلال نے جدَّہ میں اس سے بھی بڑی عمارت بنانے کا اعلان کر دیا ہے جو دھڑا دھڑ بنتی چلی جارہی ہیں، عرب کی عمارتیں سارے جہان سے اونچی ہوچکی ہیں...! عرض کرنے کا مقصد صرف یہ کہ میرے پیارے رسول حضرت مُحمّد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو فرمایا وہ پورا ہو چکا ہے اور پیشگوئی پوری ہوکر اپنے نکتہ کمال کو پہنچ چکی ہے...! عرب کا سب سے زیادہ تیل خریداری کرنے والے امریکہ نے صَدَّام کو ختم کر کے تیل کی دولت سے سَیراب ملک عِرَاق کے کنوؤں پر قبضہ جمالیا ہے اور لاکھوں بیرل مُفت وصول کر رہا ہے تو پھر تیل کی گِرتی مانگ نے تیل کی قیمتوں کو نچلی سطح پر پہنچادیا جس سے عرب ممالک کا سُنہرا دَور خاتمے کے قریب ہے...! سوال پیدا ہوتا ہے اس زوال کے بعد کیا ہے...؟ اللہ کے رَسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک اور حدیث ہے کہ: ''قیامت سے پہلے سَرزَمینِ عرب دوبارہ سَرسَبز ہو جائیگی'' (صحیح مسلم) سعودی عرب اور امارات میں بارشیں شروع ہوچکی ہیں، مکّہ اور جدَّہ میں سَیلاب آچکے ہیں۔ عرب سرزمین جسے پہلے ہی جدید ٹیکنالوجی کو کام میں لا کر سرسبز بنانے کی کوشش کی گئی ہے وہ قدرتی موسم کی وجہ سے بھی سرسبز بننے جارہی ہے۔ سعودی عرب گندم میں پہلے ہی خودکفیل ہو چکا ہے، اب وہاں خشک پہاڑوں پر بارشوں کی وجہ سے سبزہ اُگنا شروع ہو چکا ہے، پہاڑ سرسبز ہونا شروع ہو گئے ہیں۔ بارشوں کی وجہ سے آخرکار حکومت کو ڈیم بنانا ہوں گے جس سے پانی کی نہریں نکلیں گی، ہریالی ہوگی، سبزہ مزید ہوگا، فصلیں لہلہائیں گی، یوں یہ پیشگوئی بھی اپنے تکمیلی مَراحِل سے گزرنے جارہی ہے اور جو میرے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا اسے ہم اپنی آنکھوں سے دیکھتے جا رہے ہیں...! اگر احادیث پر غور کریں تو مَشرقِ وسطیٰ کے زوال کا آغاز ملکِ شام سے شروع ہوا لیکن شاید عرب حکمران یا تو یہود و نصاریٰ کی چال سمجھ نہ سکے یا بے رُخی اختیار کی لیکن وجہ جو بھی ہو یا نہ ہو، سرکار صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بتائی ہوئی علامات کو تو ظاہر ہونا ہی تھا حدیث کے مطابق...! چنانچہ حدیث پاک میں ارشاد ہے۔ رسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ جب اہل شام تباہی و بربادی کا شکار ہو جائیں گے تو تم میں کوئی رشد و خیر باقی نہ رہے گی۔ (سنن الترمذی 2192)

میرے محترم و مکرم قارئین کرام یاد رکھیں احادیث کی روشنی میں شام سے اُمت محمدیہ کا مستقبل وابستہ ہے اگر ملکِ شام ایسے برباد ہوتے رہا تو ساری اُمت کے لئے بھی خیر نہیں، ویسے تو 90 فیصد برباد ہو چکا.....! اب جبکہ پانچ سالہ خونریزی میں 8 لاکھ بے گناہ بچّے، بوڑھے، عَورتیں شہید اور لاتعداد دوسرے ملک کی سرحدوں پر زندگی کی بھیک مانگتے ہوئے شہید ہو رہے ہیں اور اتنے ہی تعداد میں زخمی یا معذور ہو چکے، لہٰذا شام مکمّل تباہی کے بعد اب نزع کی حالت میں ہے...! اس حدیث کے حساب سے عرب ممالک کے سنہرے دَور کے خاتمہ کی اہم وجہ ملکِ شام کے مَوجودہ حالات ہیں، گویا نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک اور پیشگوئی کی عَلامت ظاہر ہو رہی ہے یا ہو چکی.....!

یاد رکھیں...! کہ ملکِ شام کے متعلّق اِسرائیل، روس، ایران و امریکہ جو بھی جھوٹے بہانے بنائے، لیکن ان سب کا اَصل ہَدَف جَزِیرَۃُ العَرَب ہے کیونکہ کفّار کا عقیدہ ہے کہ دَجّال مَسیحا ہے اس وجہ سے یہ لوگ دَجّال کے اِنتظامات مُکمّل کر رہے ہیں جس کے لیے عرب ممالک میں عَدمِ اِستحکام پیدا کرنا ہے کیونکہ مُلکِ شام پر یہود و نصاریٰ قبضہ کرنا چاہتے ہیں اور یہ ہو کر رہے گا حضرت مہدی عَلَیِ السَّلام کے ظہور سے قبل.....! چنانچہ کتابِ فِتَن میں ہے کہ: ''آخری زمانے میں جب مسلمان ہر طرف سے مَغلوب ہو جائیں گے، مسلسل جنگیں ہوں گی، شام میں بھی عیسائیوں کی حکومت قائم ہو جائے گی، علماء کرام سے سنا کہ سَعُودی، مِصر، ترکی بھی باقی نہ رہیگا ہر جگہ کُفّار کے مظالم بڑھ جائیں گے، اُمّت آپسی خانہ جنگی کا شِکار رہے گی۔ عرب (خلیجی ممالک سعودی عرب وغیرہ) میں بھی مسلمانوں کی باقاعدہ پرشوکت حکومت نہیں رہیگی، خَیبَر (سعودی عرب کا چھوٹا شہر مدینۃ المُنوَّرہ سے 170 کم فاصلے پر ہے) کے قریب تک یہود و نصاریٰ پہنچ جائیں گے، اور اس جگہ تک ان کی

حکومت قائم ہوجائے گی، بچے کھچے مسلمان مدینۃ المنوّرۃ پہنچ جائیں گے، اس وقت حضرت امام مہدی علیہ السّلام مدینہ منورہ میں ہوں گے''۔دوسری طرف دریائے طبریہ بھی تیزی سے خشک ہو رہا ہے جو کہ مہدی علیہ السّلام کے ظہور سے قبل خشک ہوگا...!

اسلئے جب مشرقِ وسطیٰ کے حالات کو خصوصاً مسلمانوں اور ساری دنیا کے حالات کو دیکھتے ہیں تو صاف نظر آتا ہے کہ دُنیا ہولناکیوں کی جانب بڑھ رہی ہے،فرانس میں حملوں کے بعد فرانس اور پوپ بھی عالمی جنگ کی بات کر چکے ہیں۔سوال پیدا ہوتا ہے اس عالمی جنگ کا مرکز کون سا خطہ ہوگا...؟ واضح نظر آرہا ہے،مشرقِ وسطیٰ ہی متوقع ہے......! یہاں بھی ہندو پاک کی رنجشیں اور کشمکش کے بڑھتے حالات سے بھی لگتا ہے کہ غزوہ ہند کی طرف رُخ کر رہے ہیں کیونکہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا:''میری قوم کا ایک لشکر وقتِ آخر کے نزدیک ہند پر چڑھائی کرے گا اور اللہ اس لشکر کو فتح نصیب کرے گا، یہاں تک کہ وہ ہند کے حکمرانوں کو بیڑیوں میں جکڑ کر لائیں گے۔اللہ اس لشکر کے تمام گناہ معاف کر دے گا۔پھر وہ لشکر واپس رُخ کرے گا اور شام میں موجود عیسیٰ ابنِ مریم علیہ السلام کے ساتھ جا کر مل جائے گا۔''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا:''اگر میں اُس وقت تک زندہ رہا تو میں اپنا سب کچھ بیچ کر بھی اُس لشکر کا حِصّہ بنوں گا،اور پھر جب اللہ ہمیں فتح نصیب کرے گا تو میں ابو ہریرہ (جہنم کی آگ سے) آزاد کہلاؤں گا۔پھر جب میں شام پہنچوں گا تو عیسیٰ ابنِ مریم علیہ السلام کو تلاش کر کے انہیں بتاؤں گا کہ میں محمّد ﷺ کا ساتھی رہا ہوں۔'' رسول پاک ﷺ نے تبسّم فرمایا اور کہا:''بہت مشکل،بہت مشکل''

(کتاب الفتن۔صفحہ ۹۰۴)(واللہ تعالیٰ اعلم)

آنے والے اَدوار بڑے پرفتن نظر آتے ہیں اور اس کے متعلّق بھی سرکار ﷺ نے فرمایا تھا کہ میری اُمّت پر ایک دَور ایسے آئے گا جس میں فِتنے ایسے تیزی سے آئیں گے جیسے تسبیح ٹوٹ جانے سے تسبیح کے دانے تیزی سے زمین کی طرف آتے ہیں،لہٰذا اپنی نسلوں کی ابھی سے تربیت اور ایمان کی فِکر فرمائیے،موبائل کے بیجا استعمال سے،دیر رات تک جاگنے،فیشن اور یہودی انداز اپنانے سے،نمازوں کو ترک کرنے سے روکئے...ورنہ آزمائش کا مقابلہ دشوار ہوگا......

***

پاکستان کیسے چل رہا ہے

ابن الوقت

پاکستان ہی کا واقعہ ہے۔ایک نالائق شخص وزیر تعمیرات بن گیا۔اس کی نالائقی کی حد کہ اسے رشوت وصول کرنے کا بھی سلیقہ نہیں تھا۔ایک دن اس کے پاس ایک ٹھیکیدار آیا اور ایک فائل پر منظوری کے عوض بیس لاکھ روپے دینے کا وعدہ کیا۔وزیر صاحب نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔جھٹ سے فائل منگوائی اور اس پر Approved لکھ دیا۔اب فائل تو منظور ہو گئی مگر اس کے بعد ٹھیکیدار کہیں نظر ہی نہیں آیا۔دو چار دن انتظار کرنے کے بعد وزیر بہت پریشان ہوا کہ اب کیا کرے؟ اسی اثنا میں اس کے چپڑاسی نے اپنے وزیر کا اُترا ہوا چہرہ اور طبیعت کی بیکلی دیکھ کر اندازہ لگایا کہ کچھ گڑبڑ ہے۔وہ وزیر صاحب کے پاس آیا اور رازداری سے کہنے لگا: ''حضور ہوں تو میں چپڑاسی مگر کافی عرصہ سے یہ وزارت میں ہی چلا رہا ہوں۔آپ مجھے اپنی پریشانی کی وجہ بتائیں میں کوئی حل نکال دوں گا۔وزیر صاحب نے بتایا کہ اس طرح میں نے فائل اپروو کر دی ہے مگر اب ٹھیکیدار نظر ہی نہیں آرہا۔چپڑاسی نے کہا فائل واپس منگوا لیں۔وزیر نے کہا اب اس پر کٹنگ کس طرح کروں؟ چپڑاسی نے کہا جناب پریشان نہ ہوں۔کوئی کٹنگ نہیں ہوگی۔فائل واپس آئی۔چپڑاسی نے کہا آپ اس Approved سے پہلے Not لکھ دیں۔مقصد پورا ہو جائے گا اور کوئی کٹنگ وغیرہ بھی نہیں ہوگی۔وزیر نے ایسا ہی کیا۔جب ٹھیکیدار کو پتہ چلا تو بھاگا بھاگا آیا اور بیس لاکھ روپے کا بریف کیس وزیر صاحب کی میز کے نیچے رکھ دیا۔اب وزیر پھر پریشان ہو گیا اور چپڑاسی کو بلایا کہ اب کیا کروں؟ چپڑاسی بولا:''جناب عرصہ ہوا یہ وزارت میں ہی چلا رہا ہوں۔آپ نے فائل پر جہاں Not لکھا ہے وہاں ٹی'' کے بعد ای'' لگا دیں۔یعنی Not کو Note بنا دیں۔تو یہ بن جائے گا Note Approved وزیر نے ایسا ہی کیا اور من کی مراد پائی۔

(شنید ہے کہ بہت سے محکمے وزراء نہیں چپڑاسی چلا رہے ہیں کہ ان کا تجربہ اور ذہانت بہت سے وزراء سے بہتر اور زیادہ ہے)

***

قائداعظم محمد علی جناح کے والدین کی شادی کیسے طے پائی؟

محترمہ فاطمہ جناح

محترمہ فاطمہ جناح خاندانی پس منظر سے پردہ اُٹھاتی ہیں۔

انیسویں صدی کے آخر میں ہندوستان میں برطانوی راج کا سورج انتہائی تیزی سے طلوع ہونا شروع ہوگیا تھا۔ برصغیر ہندوستان میں تاجروں کی حیثیت سے زندگی شروع کرنے والے برطانوی تاجر، جو کل تک ہندوستانی حکمرانوں سے مراعات، دوستی اور ہمدردانہ سلوک کی بھیک مانگا کرتے تھے، برصغیر ہندوستان پر قابض ہو چکے تھے۔ ہندوستان کی باگ ڈور ان کے ہاتھوں میں آ چکی تھی۔ اب یہ روّیہ بدل چکا تھا اور ہندوستان میں ایک ایسی حکومت قائم کر چکے تھے جو برطانوی تاج شاہی میں ایک جگمگاتے ہوئے ہیرے کی حیثیت رکھتی تھی۔ حالات میں بظاہر خاموشی تھی مگر یہ خاموشی ایک بڑے طوفان کا پیش خیمہ تھی۔ فرنگی حکمرانوں کو یقین تھا کہ انہوں نے ہندوستان کے رہنے والوں کو مہذب بنانے کے لیے جو کوششیں کی تھیں، اس سے ناراض ہندوستانیوں کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا ہوگا اور تاج برطانیہ کی عوام دوست پالیسی نے مقامی لوگوں کے دلوں سے انگریزوں سے نفرت اور سرکشی کے جذبات ختم کر دیئے ہوں تھے۔

انگریز حکمران ہندوستانیوں کے دلوں میں اندر ہی اندر کھولنے والے لاوے سے یکسر بے خبر تھے۔ 1857ء کی جنگ آزادی انگریزوں کے خلاف ایک سخت ردّعمل تھی۔ یہ بغاوت جلد ہی پورے ہندوستان میں پھیل گئی۔ یہاں تک کہ یہ ایک واقعہ انگریز حکمرانوں کے خلاف ہندوستان کی جدوجہد آزادی کی طویل کتاب کے لیے پہلے باب کی حیثیت اختیار کر گیا۔ اس جنگ آزادی میں کئی لوگوں نے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کیا۔ ہندوستان کو آزاد کرنے کے لیے اس جنگ میں جانیں قربان کرنے والے سب لوگوں کو شہدا کی حیثیت سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس واقعہ نے ہماری قوم کے ذہنوں پر گہرے اثرات مرتب کیے اور پورا ہندوستان متاثر ہوا۔ اس کے باوجود ہندوستان میں کئی علاقے ایسے بھی تھے جہاں اس کشیدہ صورت حال میں بھی زندگی پرامن اور پرسکون رہی اور وہ اردگرد ہونے والی سنگین صورتحال سے بے نیاز رہے۔ کاٹھیاواڑ کی شاہی ریاست گونڈل ایک ایسا ہی علاقہ تھا جو ممبئی پریزیڈنسی کے ماتحت تھا۔ تاج برطانیہ سے وفاداری کے طفیل ٹھاکر صاحب آف گونڈل کی حکمرانی پورے آب وتاب سے قائم تھی۔ ٹھاکر صاحب جانتے تھے کہ اپنی ریاست کو برطانیہ کے خلاف سرگرمیوں سے علیحدہ رکھنا ان کے مفاد میں تھا۔ انہیں اس بات کا خدشہ تھا کہ انہیں ریاستی حکمرانی سے محروم نہ کر دیا جائے۔ ٹھاکر صاحب کی حکومت میں گونڈل ریاست کے لوگ اپنی زندگی کے معمولات میں مشغول تھے۔ وہ اس سیاسی جدوجہد سے بالکل متاثر نہ ہوئے جس نے پورے ہندوستان کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ ریاست گونڈل کی معیشت کا انحصار زراعت پر تھا۔ نمایاں فصلوں میں کپاس، گندم، جوار اور باجرہ شامل تھیں۔ زرعی پیداوار میں جس چیز نے گونڈل کو خاص شہرت عطا کی تھی وہ یہاں کی مرچ تھی حتیٰ کہ آج بھی گونڈل کی مرچیں مشہور ہیں۔ ہمارے گھر میں میرے شعور کے ابتدائی دنوں ہی سے تمام کھانوں میں ہمیشہ مرچوں کا خوب چھڑکاؤ کیا جاتا تھا۔ ہم میں سے جس کسی کو کھانے کا ذائقہ اپنے مزاج کے مطابق محسوس نہ ہوتا تو وہ ایک پلیٹ میں سے اپنے کھانے میں مزید مرچیں ڈال لیتا تھا۔ مرچوں سے بھری ہوئی پلیٹ ہمیشہ کھانے کی میز پر پڑی رہتی تھی۔ دارالحکومت ہونے کی وجہ سے گونڈل ریاست کا سب سے بڑا شہر تھا مگر ریاست کی زیادہ تر آبادی دیہاتوں میں رہتی تھی جو سادہ اور مطمئن زندگی گزار رہی تھی۔ ان لوگوں کی دنیا چھوٹی اور مختصر سی تھی جس کی سرحدیں اس ریاست کی جغرافیائی حدود کے اندر ہی سمٹی ہوئی تھیں۔ ریاست کے دوسرے بہت سے دیہات کی طرح پانیلی بھی ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔

1857ء کے قریب جب جنگ آزادی کے ذریعے ہندوستان میں برطانوی حکومت کے خلاف منظم سیاسی اپوزیشن کے بیج بوئے جا رہے تھے، اس زمانے میں پانیلی کی آبادی ایک ہزار سے بھی کم تھی۔ اس گاؤں میں میرے دادا پونجا رہتے تھے۔ ان کے آباؤ اجداد یہیں پیدا اور فوت ہوئے تھے۔ میرے دادا پانیلی کے ان چند لوگوں میں سے تھے جو زراعت پیشہ نہیں تھے۔ ان کی کچھ دستی کھڈیاں تھیں جن پر وہ خود کاریگروں کے ہمراہ طویل اور تھکا دینے والے اوقات میں کام کرتے تھے۔ اس مشقت کے نتیجے میں وہ

ہاتھ کا بنا ہوا خام کپڑا تیار کرتے تھے جس کی فروخت سے انہیں اتنی آمدنی ہو جاتی تھی کہ ان کے خاندان کا شمار اس چھوٹے سے گاؤں کے خوشحال گھرانوں میں کیا جاتا تھا۔ان کے تین بیٹے تھے۔والجی، ناتھو اور جناح۔مؤخرالذکر ان کے سب سے چھوٹے بیٹے تھے۔ان کی ایک بیٹی تھی جس کا نام مان بائی تھا۔ جناح اپنے دونوں بھائیوں کے مقابلے میں زیادہ فعال اور ارادے کے پکے تھے۔وہ 1857ء کے تاریخی سال کے لگ بھگ پیدا ہوئے۔جس کے دوران آزادی کے پہلی ہندوستان بغاوت برپا ہوئی۔ان کے نوجوان اور بلند نظر ذہن کو پانیلی نہ صرف ایک سست رو اور خوابیدہ گاؤں معلوم ہوتا تھا بلکہ ان کے نزدیک یہ ایسی جگہ تھی جہاں زندگی محض ایک چھوٹے سے بازار اور گاؤں کے کنویں پر ہونے والی گپ شپ کے گرد گھومتی تھی۔انہوں نے سنا تھا کہ گونڈل ایک بڑا شہر ہے جہاں زندگی زیادہ فعال ہے اور کاروبار بھی وسیع ہے۔پانیلی میں رہ کر وہ بھلا کیا کر سکتے ہیں؟ دونوں بڑے بھائیوں کے ساتھ مل کر خاندانی کھڈیوں پر کام کرنے میں ان کے لیے کوئی کشش نہیں تھی۔یہ بہت چھوٹا سا کاروبار تھا۔ان کی نظریں بڑے شہر پر لگی ہوئی تھیں جہاں ان کی مہم جویانہ طبع کو تسکین مل سکتی تھی۔ان کے والد نے کاروبار کے لیے انہیں نقدی تو کم ہی دی تھی مگر نصیحت خوب کی تھی کہ کسی کاروبار میں سرمایہ لگانے سے پہلے تفصیل سے جائزہ لینا چاہیے کہ کس کاروبار میں جانا چاہیے۔تجزیہ پسند اور محتاط ذہن کے ساتھ تھوڑی پونجی کے مالک ہونے کے باعث میرے والد جلد بازی میں کوئی کاروبار شروع نہیں کرنا چاہتے تھے۔

تاہم انہیں بعض ایسے کاروبار تلاش کرنے میں زیادہ عرصہ نہیں لگا جن میں وہ جلدی جلدی خرید و فروخت کر سکتے تھے۔کاروبار سے متعلق ان کی سوجھ بوجھ اور سخت محنت کے باعث انہوں نے جلد ہی کافی منافع کما لیا۔یوں ان کے اصل سرمائے میں اضافہ ہوگیا۔چند ماہ بعد وہ جب گونڈل سے پانیلی واپس آئے تو ان کے والد یہ دیکھ کر خوش ہوئے کہ ایک بڑے شہر میں ان کے بیٹے نے منافع بخش کاروبار شروع کیا ہے۔زندگی کی پرانی اقدار پر یقین رکھنے کے باعث انہیں اندیشہ تھا کہ گونڈل جیسے بڑے شہر کی مختلف ترغیبات اور چکاچوند ان کے نوجوان بیٹے کی توجہ اس منافع بخش کاروبار سے ہٹا سکتی ہیں جسے اس نے نہایت مختصر عرصے کے دوران کامیابی سے منظم کیا ہے۔اس کے علاوہ میرے دادا کی عمر بھی بڑھتی جا رہی تھی۔ان کے دونوں بڑے بیٹوں اور بڑی بیٹی کی شادی ہو چکی تھی۔والدین کی واحد ذمہ داری اب یہ باقی رہ گئی تھی کہ ان کے سب سے چھوٹے بیٹے کی شادی کسی اچھی سی لڑکی کے ساتھ ہو جائے جس کا تعلق خود ان کے خوجہ فرقے سے ہو یا کسی دوسرے اچھے خاندان سے۔چنانچہ میرے والد کے لیے مناسب رشتے کی تلاش شروع کر دی گئی۔میرے دادا میرے والد کے پانیلی چھوڑ کر گونڈل میں ایک نئی زندگی کا مستقل آغاز کرنے سے قبل ہی ان کی شادی کر دینا چاہتے تھے۔رشتے کی تلاش میں وہ پانیلی سے باہر نکل گئے اور وہاں سے تقریباً دس میل کے فاصلے واقع دھافہ نامی گاؤں جا پہنچے۔انہوں نے فیصلہ کیا کہ ایک معزز گھرانے کی لڑکی میٹھی بائی ان کے لیے موزوں دلہن ثابت ہوگی۔رشتے طے کرانے والوں کی معرفت لڑکی کے والدین سے رابطہ قائم کیا گیا۔وہ لوگ رشتہ کرنے کے لیے تیار ہوگئے۔اس طرح میرے والد جناح اور میری والدہ میٹھی بائی کی شادی دھافہ میں 1874ء کے لگ بھگ انجام پائی۔

(کتاب ''میرا بھائی'' سے اقتباس)

شگفتہ شفیق

دل سے پیغام اُلفت مٹانے کے بعد
کھو دیا پھر تجھے ہمیں پانے کے بعد
وہ سُلگتے رہے دل جلانے کے بعد
ہم تو ہنس پڑے ٹوٹ جانے کے بعد
اب تو رستے بھی اپنے جدا ہو گئے
بات بنتی نہیں چوٹ کھانے کے بعد
جائیں جائیں ہمیں کچھ نہیں واسطہ
دل لگی نہ کریں دل جلانے کے بعد
ہم کو اس سے کہاں کوئی انکار ہے
گھر بنا ہے مکاں تیرے جانے کے بعد
جانتی ہوں کہ اس کا ہے شیوہ یہی
وہ رُلائے گا ہمیں ہنسانے کے بعد
شادماں وہ نظر آرہے تھے بہت
کیفیت اپنے غم کی چھپانے کے بعد
سوچتی ہوں شگفتہؔ عجب بات ہے
ہم نے پایا ہے اس کو گنوانے کے بعد

بہاولپور میں کوڑا صاف کرنے والی ''رولز رائس'' گاڑیاں کارساز کمپنی نے نواب آف بہاولپور سے معافی مانگی

تنزیل الرحمن جیلانی

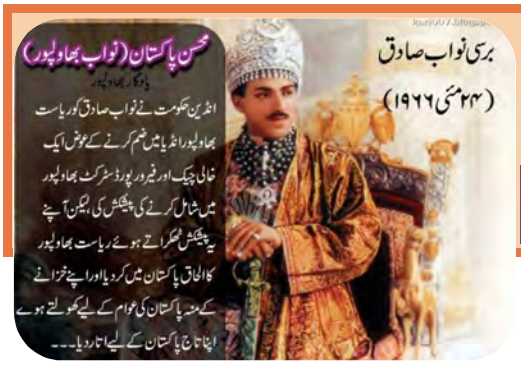

نواب صادق محمد خان 1904ء میں پیدا ہوئے۔ان کی پیدائش کے 3 سال بعد ہی 1907ء میں ان کے والد نواب محمد بہاول خان عباسی انتقال کر گئے اور اس طرح صرف 3 سال کہ عمر میں ہی نواب صادق محمد خان بہاولپور ریاست کے حکمران بنے۔نواب آف بہاولپور نے ایچیسن کالج سے تعلیم حاصل کی۔کوئٹہ سے فوجی تربیت حاصل کرنے کے بعد 1922ء میں لیفٹیننٹ کے عہدے پر فائز ہوئے اور بعد میں ترقی کرتے ہوئے 1946ء میں میجر جنرل کے عہدے تک پہنچے۔تقسیم ہند کے وقت بہاولپور ریاست کو مکمل آزادی دی گئی کہ وہ جس ملک کے ساتھ چاہے اپنا الحاق کر لے۔اسی سلسلے میں پنڈت جواہر لال نہرو نواب آف بہاولپور سے ملاقات کرنے لندن بھی گئے اور بھارت سے الحاق کرنے پر زور دیا اور کئی طرح کی مراعات دینے کا وعدہ بھی کیا لیکن نواب صادق محمد خان نے صاف انکار کر دیا اور 5 اکتوبر 1947ء میں حکومت پاکستان سے الحاق کا اعلان کرتے ہوئے معاہدے پر دستخط کئے۔نواب آف بہاولپور قائداعظم کے بہترین اور قریبی دوستوں میں سے تھے۔ آزادی کے بعد حکومت پاکستان کی بھرپور مدد کی اور سرکاری ملازمین کو تنخواہیں خود بہاولپور کے ریاستی خزانے سے ادا کی گئیں۔ 1955ء میں نواب آف بہاولپور اور جنرل غلام محمد کے درمیان ایک معاہدہ طے پایا جس کے تحت بہاولپور ریاست کو مغربی پاکستان کے ایک صوبے کا حصہ بنا دیا گیا اور حکومت پاکستان کی جانب سے نواب آف بہاولپور کے لئے 32 لاکھ روپے سالانہ بطور وظیفہ مختص کر دیا گیا۔نواب آف بہاولپور صادق محمد خان سادہ لیکن خوددار شخصیت کے مالک تھے۔اپنے لندن میں قیام کے دوران ایک روز سادہ لباس میں عام شہری کی طرح ٹہلنے نکلے اور اسی دوران دنیا کی معروف ترین کارساز کمپنی ''رولز رائس'' کے شوروم پر نظر پڑی۔شوروم میں کھڑی گاڑیاں بے حد پسند آئیں لیکن جب ان کی قیمت معلوم کرنے کے لئے اندر داخل ہونے لگے تو دروازے پر موجود گارڈ نے ان کو غریب ایشیائی باشندہ سمجھ کر ان کی بے عزتی کر دی اور کہا کہ یہ گاڑیاں تمہاری پہنچ سے بہت دور ہیں۔گارڈ کی اس بدتمیزی کے بعد نواب آف بہاولپور واپس ہوٹل آئے اور اگلے ہی دن پورے شاہی لوازمات کے ساتھ ملازموں کی فوج لے کر شوروم پہنچے اور وہاں موجود چھ کی چھ گاڑیاں خرید لیں اور ملازموں کو حکم دیا کہ فوراً یہ گاڑیاں بہاولپور بھجوا کر میونسپلٹی کے حوالے کر دی جائیں اور ان گاڑیوں سے شہر کو صاف کرنے اور کوڑا اٹھانے کا کام لیا جائے۔جب بہاولپور میں رولز رائس گاڑیاں کوڑا اٹھانے لگیں تو یہ بات پوری دنیا میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی اور مارکیٹ میں رولز رائس کی قیمت تیزی سے گرنے لگی۔دنیا میں رولز رائس کمپنی کی ساکھ کو بری طرح نقصان پہنچا کہیں بھی رولز رائس کا نام لیا جاتا تو لوگ ہنسنے لگتے اور کہتے کہ ''وہی رولز رائس جس سے پاکستان کے شہر بہاولپور میں کوڑا اٹھایا جاتا ہے''۔اس صورتحال سے پریشان ہو کر رولز رائس کمپنی کے مالک نواب صاحب سے معافی مانگنے خود بہاولپور آئے اور تحریری معافی نامہ پیش کیا اور درخواست کی کہ گاڑیوں کو کوڑا اکٹھا کرنے اور صفائی کے کام سے ہٹا دیا جائے۔نواب صادق محمد خان نے ان کی معافی قبول کرتے ہوئے تمام گاڑیوں کو کوڑے اور صفائی کے کام سے ہٹا دیا۔رولز رائس کمپنی کے مالک نے نواب آف بہاولپور کو بطور تحفہ چھ نئی گاڑیاں بھی پیش کیں جن میں سے ایک نواب صادق محمد خان نے پاکستان کے دورے پر آئے سعودی عرب کے شاہ کو تحفے میں دے دی جو سعودی عرب کی سرزمین پر چلنے والی پہلی رولز رائس گاڑی تھی۔رولز رائس اس وقت دنیا کی 10 مہنگی ترین گاڑیوں میں شامل ہوتی ہے۔محب وطن اور اعلیٰ صفت نواب آف بہاولپور نے 1966ء کو لندن میں وفات پائی بعد ازاں ان کے جسدِ خاکی کو بہاولپور منتقل کر کے ان کے آبائی قبرستان میں سپرد خاک کر دیا گیا۔

☆.....☆

بہترین پوسٹ ہے

احمد کھرل

..اور جناب نے بجا فرمایا کہ شعور و آگہی کا تقاضا بھی یہی ہے رائے دہی اور تمام معمولات زندگی میں اک پڑھی لکھی عورت یا لڑکی کو پورا حق دیں آلو میں گوبھی تلاش مت کریں..ہاں بیشک پڑھی لکھی لڑکی میں یہ شعور بیدار کریں کہ وہ بڑوں کی عزت کو ممکن بنائے.کسی بڑے کی بات کو درمیان میں سے نہ کاٹے...دلائل سے قائل کرے اپنا فیصلہ صادر فرمانے سے قبل..گھر کا سربراہ'' یہ اک ایسا پہلو ہے اس تصویر کا جس کا تعین ابھی ہونا باقی ہے کہ اک پڑھی لکھی لڑکی کو گھر کا سربراہ بنایا جائے یا اس کے اَن پڑھ باپ یا سسر کو؟ پڑھی لکھی لڑکی کو یا اس کے پڑھے لکھے شوہر کو؟؟ ہمیشہ کوئی بھی قوم ملک یا گھر اک سربراہ کے بغیر فعال نہیں ہوسکتا اور پھر سربراہ کی مکمل تابعداری بھی لازم ہے..مگر میں تذبذب کا شکار ہوں اس تحریر کو پڑھنے کے بعد کہ آیا اک گوبھی آلو کو سربراہ مانے گی یا نہیں...اب بجلی کے بل ہماری پڑھی لکھی عورت جمع کرواتی ہے اور آلو گھر میں لیٹے اسکے شعور و آگہی کے گن گاتے پھریں تو کیا ہماری دینی تعلیمات سے یہ شعور و آگہی متصادم تو نہیں؟ حقوق بیشک ادا ہونے ضروری ہیں مگر فرائض کی آگہی کی ضرورت ابھی باقی ہے..آپ کو اختلاف کا حق ہے۔

آپ کو اختلاف کا حق ہے

طالب دعا۔ ندیم احمد فرخ

سقراط ایک عظیم اُستاد۔ میرے پسندیدہ کریکٹرز میں سے ایک سقراط ہے۔ سقراط کی درسگاہ دوسرے فلاسفروں کے مدارس سے مختلف تھی، سقراط ہمیشہ مکالمے کو اہمیت دیتا تھا۔ چنانچہ اُسکی درسگاہ میں مختلف خیالات کے حامل لوگوں کو اکٹھا ٹھہرایا جاتا تھا۔ یہ متضاد خیالات کے لوگ ہوتے تھے، یہ اکٹھے رہتے، اکٹھے کھاتے، پیتے، مطالعہ کرتے، ورزش کرتے اور پانی کے ایک ہی تالاب میں نہاتے اور ہر وقت مکالمہ اور گفتگو میں مگن رہتے تھے۔ یہ اپنے اپنے موقف کی سچائی میں دلائل دیتے، جواز تراشتے، منطق گھڑتے، سقراط کے شاگرد چوبیس گھنٹے کے دانشور ہوتے، یہ رات کو سوتے سوتے اچانک اُٹھ کر بیٹھ جاتے اور اپنے مخالف کو جگا کر کہتے کہ مجھے تمہارے سوال کا جواب مل گیا ہے۔ میری بات سنو اور وہ اس کے بعد اپنی دلیل دینا شروع کر دیتے، یہ لوگ اس وقت تک دلائل ڈھونڈتے رہتے جب تک دوسرا فریق ہار نہیں مان لیتا لیکن یہ لڑائی صرف زبانی اور دلائل کے ساتھ کرتے، کوئی دانشور، عالم، شاگرد، دست و گریبان نہیں ہوتا تھا۔ سقراط نے اپنی درسگاہ کا صرف ایک ہی اصول رکھا اور وہ تھا برداشت، یہ لوگ ایک دوسرے کے خیالات کو تحمل سے سنتے اور اپنی رائے پیش کرتے، جو شاگرد ایک خاص حد سے اُونچی آواز میں گفتگو کرتا، دوسرے کو گالی دیتا، دھمکی دیتا، جسمانی لڑائی کرتا اس کو فوراً درسگاہ سے فارغ کر دیا جاتا۔ سقراط کے نزدیک اختلاف، دلائل، منطق پڑھے لکھے لوگوں کا کام ہے، یہ فن جب تک پڑھے لکھے، عالم اور فاضل لوگوں کے پاس ہوتا، معاشرہ ترقی کرتا رہتا اور جب مکالمہ یا اختلاف جاہل لوگوں کے ہاتھ آجاتا تو پھر معاشرہ انارکی، افراتفری، پستی کا شکار ہو جاتا ہے۔ سقراط کے شاگرد معاشرے میں ایک خاص فقرے سے پہچانے جاتے، جب بھی یہ لوگ کسی محفل، بیٹھک، ہجوم میں کوئی خلافِ فطرت یا خلاف فہم بات سنتے یا دیکھتے تھے تو یہ دایاں ہاتھ فضا میں بلند کر کے کہتے ''مجھے اختلاف ہے۔'' لوگ جان جاتے کہ یہاں کوئی عظیم فلاسفر سقراط کا کوئی شاگرد موجود ہے، یہ گروپس بھی ایسے ہی مکالمہ کے لئے بنائے جاتے ہیں کہ.....آئیں اور ہاتھ کھڑا کریں اور بولیں ''مجھے اختلاف ہے'' کیونکہ یہ آپکا حق ہے دلائل دیں اور دلائل لیں...

***

گورکن

فراز حمید خاں

میں نے گورکن بابا سے پوچھا بابا جی گناہگاروں کی قبروں کا بھی کچھ احوال بتائیں، بابا جی افسردہ لہجے میں بولے ایسے آدمی کی قبر تیار کرتے ہوئے بہت مشقت کرنی پڑتی ہے۔ قبر کی مٹی سخت ہوتی ہے تو کہیں پتھر قبر کی تیاری میں روکاوٹ بن جاتے ہیں آج کل قبروں کی کھدائی کی دوران سانپ بچھو کا نکل آنا عام بات ہوگئی ہے۔ کئی قبروں کی کھدائی کرتے ہوئے عجیب سی وحشت اور گھبراہٹ پیدا ہوتی ہے چونکہ قبر کی کھدائی ننگے پاؤں کی جاتی ہے کئی قبروں کی کھدائی میں میرے پاؤں جلنے شروع ہوگئے میں نے اپنی زندگی میں قبر کی تیاری کے دوران قبر سے دھواں بھی نکلتے دیکھا اور آگ کے شعلے بھی کئی قبروں میں تدفین کے بعد قبروں پر رات کو آگ جلتی بھی دیکھی اور کچھ قبروں سے چیخ و پکار کی آواز بھی سن چکا ہوں۔ یہ باتیں بابا جی میرے مختلف سوالوں کے جواب میں مجھے بتا رہے تھے اور عالم تصور میں مَیں اپنی قبر کی فکر میں گم ہوگیا کہ نا جانے میری قبر سے روشنی نکل کر گورکن کا وجود روشن کرے گی یا گورکن کے پیر جلائیگی اور پھر کیا خبر قبر بھی نصیب ہو یا نہیں۔ دوستو یہ میری اور آپ کی فانی زندگی کی حقیقتیں ہیں جو میں آپ محسنوں کے خدمت میں عرض کر رہا ہوں۔ میں نے زندگی کی رنگینیاں بھی دیکھی ہیں اور اندھیری راتوں میں قبرستانوں کے سناٹے بھی۔ قبر ہمارا ہو مستقل گھر ہے جس میں ہمارا صور کے پھونکے جانے تک رہنا مقدر ٹھہر چکا ہے۔

کبھی کبھی اپنے دلوں کو موہ لینے والے عارضی گھروں کو کچھ دیر کے لئے فراموش کر کے قبرستان میں جہاں میں اور آپ اپنی مستقل رہائش اختیار کرنے والے ہیں جا کر ان کے مکینوں کی رہائش گاہوں کو بھی دیکھ آیا کریں تا کہ اپنی رہائش گاہ کے پلاٹ کا بھی اندازہ ہو اور اس میں اپنی رہائش کے لئے خیالوں اور تصور میں تانے بانے بھی بنتے رہا کریں۔ میرے عزیزوں قبرستان دنیا کے واحد انٹرنیشل ہاؤسنگ سوسائٹی ہے جس میں آپ کو دو گز کا پلاٹ بغیر ترقیاتی کاموں کے ملتا ہے جہاں ہر فرد کو اپنے پلاٹ میں روشنی، کشادگی خوشگوار ہواؤں اور باغات وغیرہ کا انتظام پہلے سے خود کر کے آنا پڑتا ہے۔ لہذا کیا ہی اچھا ہو جب میں اور آپ اپنے مستقل گھروں کو جائیں تو سارے انتظامات پہلے سے مکمل ہوں۔ اور کمی ہو تو صرف میری اور آپ کی آمد کی اللہ ہم سب کو اس آنے والی منزل کو آسان بنائے۔ آمین۔

***

زمین ایک سیارہ

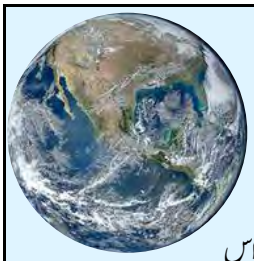

ڈاکٹر مہران خان

ہماری زمین کا گولا نہ صرف ایک سیارہ ہے بلکہ اس کا مطالعہ دوسرے سیاروں اور ان کے ذریعہ کائنات کو سمجھنے کا بہترین ذریعہ بھی ہے۔ زمین کی کمیت (Mass) پڑوسی سیاروں زہرہ اور مریخ کے کم و بیش مماثل ہے۔ ہمارے نظام شمسی کے بیرونی سیارے مشتری، زحل، یورانس اور نپ چون اس سے بڑے یا بہت بڑے ہیں اور سورج کا مقدارِ مادہ ہماری زمین کا ساڑھے تین لاکھ گنا ہے۔ زمین نظام شمسی میں تیسرا سیارہ ہے۔ یہ واحد معلوم سیارہ ہے جس پر زندگی پائی جاتی ہے۔ تازہ ترین سائنسی شواہد کے مطابق زمین 54.4 ارب سال قبل وجود میں آئی۔ یہ سورج کے گرد اپنے مدار کا سفر 26.365 دنوں میں مکمل کرتی ہے۔ زمین کا تقریباً 71 فیصد حصہ پانی سے گھرا ہے۔ زمین کے قطبین پر زیادہ تر برف جمی رہتی ہے۔ زمین پر وجود میں آنے والی جانداروں کی 99 فیصد انواع وقت کے ساتھ ناپید ہوگئیں۔ زمین کی کمیت یا ماس زیادہ تر لوہے (1.32 فیصد)، آکسیجن (1.30 فیصد)، سلیکان (1.15 فیصد)، مگنیشیئم (9.13 فیصد)، سلفر (9.2 فیصد)، نکل (8.1 فیصد)، کیلشیم (5.1 فیصد) اور ایلومینیم (4.1 فیصد) پر مشتمل ہے۔ زمین پر سب سے زیادہ ریکارڈ کیا جانے والا درجہ حرارت 7.56 سینٹی گریڈ ہے۔ اسے کیلی فورنیا کی ''ڈیتھ ویلی'' میں 1913ء میں ریکارڈ کیا گیا۔ کم سے کم ریکارڈ کیا جانے والا درجہ حرارت منفی 2.89 سینٹی گریڈ ہے جسے انٹارکٹکا میں وسٹوک سٹیشن پر ریکارڈ کیا گیا۔

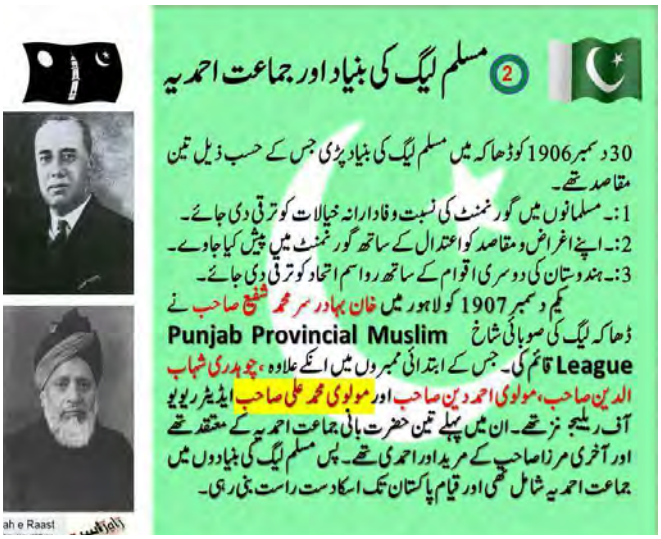

حکایاتِ سعدی عاصی صحرائی

کنجوس کا مال

بیان کیا جاتا ہے کہ ایک مال دار سوداگر اس قدر کنجوس تھا کہ مہمانوں کے لیے اس کا دروازہ ہمیشہ بند اور دسترخوان لپٹا ہوا رہتا تھا۔ ایک بار اس نے سامانِ تجارت جہاز پر لادا اور ملک مصر کی طرف روانہ ہوا۔ غرور سے اس کی گردن یوں اکڑی ہوئی تھی کہ گویا اس زمانے کا فرعون ہو۔ اسے یقین تھا یہ تجارتی سفر اس کے لیے بہت زیادہ نفع رساں ثابت ہوگا لیکن ہوا یہ کہ جب وہ آدھا راستہ طے کر چکا تو سمندر میں طوفان آ گیا اور اس بخیل کا جہاز غرق ہو گیا۔ طوفان کے آثار دیکھ کر اس بخیل نے بہت دعائیں مانگیں لیکن دعاؤں سے اسے کچھ فائدہ نہ پہنچا۔ ایسے شخص کی دعا شاید مشکل سے قبول ہوتی ہے جس کے ہاتھ مانگنے کے لیے تو خدا کے سامنے پھیل جائیں لیکن کسی کو کچھ دینا پڑے تو بغلوں میں چھپا لے۔ اس بخیل کا چھوڑا ہوا مال اور جائیداد اس کے ان غریب رشتے داروں کے ہاتھ آئی جنہیں اس نے زندگی میں کبھی نہ پوچھا تھا اور وہ خوب شان و شوکت سے زندگی گزارنے لگے۔ گر خدا نے مال بخشا ہے تو اس کو خرچ کر خود بھی راحت اس کی پا اوروں کو بھی آرام دے یا در کھ اک روز یہ گھر چھوڑنا ہوگا تجھے جمع جس میں کر رہا ہے سونے چاندی کے ڈلے حضرت سعدی نے اس حکایت میں بخیلوں کے حسرت ناک انجام سے آگاہ کیا ہے اور وہ بلاشبہ یہ ہے کہ ایک دن موت اچانک انہیں آلیتی ہے اور وہ مال جسے انہوں نے بصد دشواری حاصل کیا تھا، دوسروں کو مل جاتا ہے جو خوب عیش کرتے ہیں۔

امجد مرزا امجدؔ، لندن

لَمّے سجدے کر بیٹھا ہاں
اس دے در تے مر بیٹھا ہاں
یاد دی گرمی ٹھنڈی پے گئی
ایہسے ٹھنڈ چے ٹھر بیٹھا ہاں
برفاں اگّاں بن بن آئیاں
ہر کوئی آکھے سڑ بیٹھا ہاں
مُڑ کِڑھ کھوتی بوھڑ دے تھلے
ہر کم کرکے گھر بیٹھا ہاں
اکھراں دی تلوار سی چلی
پھٹ جگر دے جر بیٹھا ہاں
سر تے غم دے بدّل بھارے
ساون اکھیوں ورھ بیٹھا ہاں
بازی عشق دی عمراں لنگیاں
جِت کے امجدؔ ہَر بیٹھا ہاں

***

دنیا کے متعلق دلچسپ معلومات

تنزیل الرحمان جیلانی

دورِ حاضر میں جدید ٹیکنالوجی کی مدد سے کسی بھی قسم کی معلومات حاصل کرنا کوئی مشکل کام نہیں، لیکن دنیا سے متعلق چند دلچسپ حقائق ایسے ہیں جن سے عام آدمی آج بھی ناواقف ہے۔ دنیا کی موجودہ آبادی روزانہ 400 بلین گیلن پانی استعمال کرتی ہے۔ دنیا میں موجود پانی کا صرف 3 فیصد حصہ قابل استعمال ہے جس میں سے 1 فیصد زیرِ زمین اور دریاؤں میں پایا جاتا اور 2 فیصد پہاڑوں پر گلیشیرز کی صورت میں جامد ہے۔ جبکہ 97 فیصد پانی نمکین ہے۔ ایک بہت بڑا زیرِ زمین دریا، مشہور دریائے نیل کے نیچے بہتا ہے جو اوپر بہنے والے دریا سے 6 گنا بڑا ہے۔ اگر سمندر کا پانی صاف ہو تو سورج کی روشنی 240 فٹ کی گہرائی تک پہنچ سکتی ہے۔ خلیج فارس دنیا کا سب سے گرم سمندر ہے۔ گرمیوں میں اس سمندر کا درجہ حرارت 6.35 ڈگری سینٹی گریڈ تک پہنچ جاتا ہے۔ چاند صحرائے گوبی سے ایک ملین گنا زیادہ خشک سیارہ ہے۔ زمین خلا میں 67000 میل فی گھنٹہ کی رفتار سے سفر کرتی ہے۔ براعظم ایشیا دنیا کی 60 فیصد آبادی کی نمائندگی کرتا ہے لیکن اس براعظم کا رقبہ دنیا کے کل رقبے کا صرف 30 فیصد ہے۔ دنیا کا سب سے تباہ کن زلزلہ 1557ء میں وسطی ایشیا میں آیا جس میں 8 لاکھ 40 ہزار سے زائد لوگ لقمہ اجل بنے۔ زمین کی سطح کا کل رقبہ 197 ملین اسکوائر ہے۔ زمین پر 540 آتش فشاں پہاڑ موجود ہیں لیکن جدید ٹیکنالوجی اور سائنس کے باوجود زیرِ آب کتنے آتش فشاں پہاڑ ہیں اور ان کے پھٹنے کا وقت کیا ہے اس کا اندازہ کسی کو بھی نہیں ہے۔

بدترین غلامی کی جانب سفر

مدثر ممتاز مغل

کسی کو اندازہ ہے کہ ہم جیسے پسماندہ ملکوں میں بڑے بڑے موٹروے، شاندار ایئرپورٹ، شہری زندگی کے چمک دمک والے منصوبے، عالمی فاسٹ فوڈ کی دکانیں، ہر طرح کے فیشن برانڈ، شاپنگ مال، عالمی معیار کے تھیٹر، سینما گھر اور ثقافتی مرکز کیوں کھولے جاتے ہیں؟ غربت کی ماری ان اقوام کا ایسا جزیرہ نما روشن چہرہ کس مقصد کے لیے تخلیق کیا جاتا ہے؟ یہ تمام پسماندہ ممالک سرمایہ کاری کے لیے دنیا بھر میں بدنام سمجھے جاتے ہیں، لیکن کوئی سوال نہیں کرتا کہ فاسٹ فوڈ کے ریستورانوں، فیشن کی دکانوں اور دیگر مصنوعات پر آپ کی سرمایہ کاری خطرے میں کیوں نہیں پڑتی؟ جس ملک (پاکستان) میں چھ کروڑ لوگ بس کا نمبر تک نہ پڑھ سکتے ہوں وہاں شاندار ایئر کنڈیشنڈ بس چلا دی جائے؟ جہاں روزانہ لاکھوں لوگ صاف پانی نہ ہونے کی وجہ سے جان لیوا بیماریوں کا شکار ہو جائیں وہاں ان کے کچے مکانوں اور تعفن زدہ محلوں کے درمیان سے چمکتی ہوئی موٹروے گزرے؟ ایک چمکدار سڑک جس کے دونوں جانب کروڑوں مفلوک الحال رہتے ہوں جن کی بستیاں ایک ہزار سال پرانے دور کی یادگار معلوم ہوں اور موٹروے پر سفر کرنے والے بڑی بڑی گاڑیوں میں بیٹھے وہاں پر موجود لوگ زندگی کو ایسے دیکھیں جیسے افریقہ کے سفاری پارک میں گاڑیاں گزارتے ہوئے قدرتی ماحول میں اُچھلتے کودتے جانوروں کو دیکھتے ہیں۔ پاکستان جیسے غریب و افلاس کا شکار لیکن زمینی وسائل سے مالا مال ملک ایک عالمی تماشہ گاہ ہے۔ جہاں کے رہنے والے کروڑوں لوگوں کی تعلیم، صحت، رہائش اور روزگار کے لیے کوئی قرضہ نہیں دیتا، جہاں معاشی اور صنعتی ترقی کے لیے کوئی امداد مہیا نہیں کرتا، بلکہ صرف اور صرف بڑے بڑا انفراسٹرکچر بنانے کے لیے دنیا بھر کے ممالک اور عالمی مالیاتی ادارے دولت کی بوریاں اور بڑی بڑی سفارشات لے کر ان ملکوں پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ یہ ایسا کیوں کرتے ہیں؟ ان ممالک کے سیاسی رہنما، دانشور اور صحافی اگر صرف دو کتابوں کا مطالعہ کر لیں تو انہیں ہر ایسے ''شاندار'' منصوبے سے نفرت ہونے لگے گی۔ انہیں وہ مستقبل نظر آ جائے جو ہر اس غریب ملک کا مقدر بنا، جنھوں نے ان منصوبوں کے لیے اپنی قوموں کو قرض کی دلدل میں اُتارا، ان منصوبوں کی تعریف و توصیف سے شہرت کے محل کھڑے کیے، لیکن ان عوام کو صحت، تعلیم، صاف پانی، سیوریج، امن و امان، بنیادی رہائش اور روزگار فراہم نہ کر سکے۔ ان حکمرانوں کے نام کی تختیاں ان ائرپورٹس، موٹرویز، ثقافتی مراکز اور یادگاروں پر لٹکتی رہیں اور عوام کی نسلیں غربت و افلاس کے باوجود ان عیاشیوں کے لیے لیا گیا قرض ادا کرتی رہیں۔ یہ دونوں کتابیں ایک ایسے معیشت دان نے لکھی ہیں جو دنیا بھر کے ممالک میں ایسے تباہ کن منصوبے لے کر جاتا رہا اور ان منصوبوں کی وجہ سے یہ تمام ملک بدترین انجام تک پہنچے۔ یہ شخص جان پرکنز (John Perkins) اور اس کی پہلی کتاب ''Confessions of an Economic Hitman'' اور اور دوسری کتاب ''The Secret History of American Empire'' ہیں 2006ء اور 2009ء میں آئیں۔ خوش قسمتی کی بات یہ ہے کہ دونوں کتابوں کا اردو ترجمہ ''ایک معاشی غارت گر کی کہانی'' اور ''امریکی مکاریوں کی تاریخ'' کے نام پر سے اب ہو چکا ہے۔ یہ دونوں کتابیں کسی ناول کی طرح دلچسپ، حیرت ناک اور سنسنی سے بھر پور ہیں۔ اس میں مصنف نے پانامہ، کولمبیا، وینزویلا، ایکویڈور، انڈونیشیا، مصر اور افریقہ کے ممالک میں اپنی سرگرمیوں کی داستانیں بیان کی ہیں۔ اس کی کتابیں پڑھنے کے بعد آپ کو اپنے رہنماؤں کی بے ضمیری، وطن فروشی اور بد دیانتی پر رونا آنے لگتا ہے۔ آپ سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ کھیتوں میں کام کرنے والا، سڑک پر بجری کوٹنے والا، مشینوں پر زندگی ختم کرنے والا، نائی، موچی، ترکھان، جولاہا اور کمہار، ان شاندار انفراسٹرکچر پراجیکٹس اور ترقی کی علامت موٹرویز اور شہری سہولیات کا قرض اُتارتے، اُتارتے افلاس اور بیماری میں خون تھوکتے زندگی کی بازی ہار جاتا ہے۔ پرکنز اپنی کتابوں میں اس ساری سازش کے تین مدارج بتاتا ہے۔

مصنف بتاتا ہے کہ دنیا بھر کے وہ تمام امیر ممالک جن کی نظر غریب ممالک کے معدنی وسائل پر ہوتی ہے وہ میرے جیسے ''معاشی ضرب کار'' (Economic Hitman) پالتے ہیں۔ ان افراد کی تنخواہ اور اخراجات وہ بڑی بڑی کنسٹرکشن کمپنیاں اور تیل و معدنی وسائل پر قبضہ کی

خواہش مند کارپوریشن اُٹھاتی ہیں۔ان معاشی ضرب کاروں کو جس بھی ملک میں بھیجا جاتا ہے، یہ اس کے حوالے سے بڑی بڑی سڑکوں، ائیر پورٹوں اور دیگر خوشنما منصوبوں سے بھری رپورٹیں تیار کرتے ہیں۔ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ کس طرح اس غریب ملک کو زیادہ سے زیادہ قرضے کی دلدل میں ڈبویا جا سکتا ہے۔ جہاں دو رویہ سڑکوں کی ضرورت ہوتی ہے وہاں مستقبل کی منصوبہ بندی کا بہانہ بنا کر چار رویہ سڑکوں پر زور دیا جاتا ہے۔

یہاں وہ اپنے ایک ہم پیشہ کی مثال دیتا ہے جس نے انڈونیشیا کے بارے میں ایک حقیقت پسندانہ اسکیم بنائی تو اسے نوکری سے نکال دیا گیا۔ اس کے کے بعد پرکنز کو ذمے داری سونپی گئی اور اس نے 25 گنا لاگت کے منصوبے بنا کر پیش کیے جنہیں عالمی بینک اور قرضہ دینے والے ممالک نے خوشدلی سے قبول کرلیا۔ جب ایسے منصوبے تیار ہو جاتے ہیں تو پھر یہ ''ہٹ مین'' اس ملک کی سیاسی قیادت، بیوروکریسی اور دیگر کارپردازوں کو انتہائی خوشنما طریقے سے بریفنگ دیتا ہے۔اس دوران اس کی تلاش ایسے بددیانت، لالچی، بے وقوف یا شہرت کے بھوکے اہل اقتدار پر ہوتی ہے جو ان منصوبوں سے سستی شہرت بھی کمائیں اور مال بھی بٹوریں۔ یہاں ان لوگوں کا ایک جتھا بن جاتا ہے۔ ہر کوئی میٹنگوں میں ان کی تعریف میں رطب اللسان ہوتا ہے۔انہیں ملک کی بقا اور سلامتی کی علامت بتاتا ہے۔ یوں جب یہ منصوبے منظور ہو جاتے ہیں تو اس امیر ملک یا مالیاتی ادارے سے قرضے کی رقم کا بندوبست بس ایک کارروائی سی ہوتی ہے۔حیرت ناک بات یہ ہے کہ یہ رقم اس امیر ملک سے غریب ملک میں منتقل نہیں ہوتی۔ امریکا ہو یا فرانس، ترکی ہو یا چین یہ ممالک قرضے کی یہ رقم اپنی کنسٹرکشن کمپنیوں کو اپنے ہی ملک میں ادا کر دیتے ہیں۔رقم اسی ملک میں رہتی ہے اور قرضہ غریب ملک کے عوام کی گردن پر۔اس کے بعد ان ہٹ مینوں کی بنائی ہوئی جعلی اعداد و شمار کی رپورٹوں پر مبنی پراپیگنڈہ شروع ہوتا ہے: یہ موٹروے بنا تو تجارت اتنے گنا بڑھے گی۔

یہ بندرگاہ بنی تو ملک پورے مشرق وسطیٰ کی تجارت پر چھا جائے گا۔ یہ ٹرین یا بس چلی پڑی تو عام آدمی کے دن بدل جائیں گے۔ان بسوں میں اور ان موٹرویز پر چلنے والی پبلک ٹرانسپورٹ میں مفلس، نادار، بیمار، بے روزگار، ان پڑھ اور پسماندہ لوگ سفر کرتے ہیں۔جنہیں نہ تعلیم ملتی ہے، نہ دوا، نہ گھر میسر ہوتا ہے اور نہ نوکری۔لیکن یہی لوگ ہیں جو ان موٹرویز، بندر گاہوں اور ایئرپورٹس کا قرض اُتار رہے ہوتے ہیں۔ جب کسی ملک پر ڈھیر سارا قرض چڑھ جاتا ہے تو پرکنز کے مطابق وہاں ''عقاب'' (Hawks) بھیجے جاتے ہیں۔ یہ وہ کمپنیاں اور کارپوریشن ہوتی ہیں جن کی نظر اس ملک کے معدنی وسائل، تیل، لوہا، تانبہ، سونا اور دیگر دھاتوں پر ہوتی ہے۔ کچھ وہاں کی زرعی زمینوں پر کارپوریٹ فارمنگ چاہتی ہیں۔ یہ عقاب اس قرضے میں جکڑی قوم کے وسائل پر یوں ٹوٹتے ہیں جیسے بھوکے بھیڑیے۔ فریقہ اس کی بدترین مثال ہے۔ پرکنز کہتا ہے کہ میں حیران ہوتا تھا کہ ان افریقی ممالک میں جہاں کروڑوں لوگ بھوک سے مر رہے تھے وہاں برگر، پیزا اور عالمی فوڈ ریستوران دھڑا دھڑ کھلتے جا رہے ہیں۔ ان کو چلانے کے لیے ایک مڈل کلاس بنائی جاتی ہے جس کو کارپوریٹ کلچر مناسب تنخواہ دیتا ہے۔

این جی اوز کو فنڈ ملتے ہیں، جن کے کے لیے مہنگی تعلیمی سہولیات اور مہنگے اسپتال۔ یہ لوگ ہیں جو اس انفراسٹرکچر کی ترقی کو اخباروں اور ٹیلی ویژن پر اصل ترقی بتاتے ہیں۔ ایسے غریب ملکوں میں اگر کوئی ان ''عقابوں'' کی بات نہ مانے تو لیڈروں کو موت کی نیند سلا دیا جاتا ہے۔ چلی کا آلندے، کانگو کا لومبا اور پانامہ کا صدر اس کی مثالیں ہیں۔ اس کے ساتھ ان ملکوں کو حقوق کی جنگ کے نام پر قتل و غارت تحفے میں دی جاتی ہے۔صرف سوڈان، روانڈا اور دارفر کی لڑائیوں میں 40 لاکھ لوگ مارے گئے۔ یوں جہاں دہشت گردوں کا راج ہو وہاں ان سے معاہدہ کر کے معدنیات حاصل کی جاتی ہیں اور جہاں امن ہو وہاں حکومت کو بلیک میل کر کے۔ انگولا اس کی بدترین مثال ہے۔اگر لیڈروں کو قتل کرنے سے بھی کام نہ چلے تو پھر اس ملک میں فوجیں اتار دی جاتی ہیں۔ یہ ہے وہ گھن چکر! اس لیے جب کوئی موٹر وے بنتا ہے، ماس ٹرانزٹ اسکیم آتی ہے، ایئرپورٹ کی توسیع ہوتی ہے تو میں کانپ اٹھتا ہوں۔ 18 کروڑ بھوکے ننگوں کے اس انجام پر جو پہلے ان عیاشیوں کا قرضہ ادا کریں گے اور پھر بدترین غلامی، دہشت اور خوف میں زندگی گزاریں گے۔

***

مبارک صدیقی

ہم تھے گلاب لوگ تیشہ بدست وہ
نکلے تھے کرکے ظلم کے سب بندوبست وہ
سمجھے تھے کم نگاہ کہ لکھتے ہیں بخت وہ
حاکم تھے اور صاحبانِ تاج و تخت وہ
پھر یوں ہوا کہ کھا گئے سارے شکست وہ
ہم ایک جان آج بھی اور لخت لخت وہ
اپنا یہی تھا جرم کہ نظریں اُٹھا کے ہم
نکلے تھے شب کے رُوبرو شمعیں جلا کے ہم
اس دل کے تا تار میں قرآں بسا کے ہم
نیزوں کے درمیاں بھی سینے سجا کے ہم
اک شہرِ کربلا تھا مگر مسکرا کے ہم
چلتے تھے کوئے یار کو پلکیں بچھا کے ہم
بیٹھے تھے موڑ موڑ پہ پہرے بٹھا کے وہ
نکلے تھے گام گام سے پرچم اُٹھا کے ہم
چلتے تھے شاخ شاخ سے جگنو اُڑا کے وہ
رکھتے تھے ڈال ڈال پہ ماہتاب لاکے ہم
چلتے تھے طاق طاق سے شمعیں بجھا کے وہ
رکھتے تھے بام بام پر سورج سجا کے ہم
کرنے چلے تھے روشنی نابود نیست وہ
قاتل تھے اورقاتلوں کے سر پرست وہ
سمجھے تھے کم نگاہ کہ لکھتے ہیں بخت وہ
حاکم تھے اور صاحبانِ تاج و تخت وہ
پھر یوں ہوا کہ کھا گئے سارے شکست وہ
ہم ایک جان آج بھی اور لخت لخت وہ
سمجھے خدا فروش کہ شاید خدا تھے وہ
اس ساری کائنات کے اب بادشاہ تھے وہ
دنیا گناہگار تھی اب پارسا تھے وہ
شاید نہیں یقین ہے اہلِ جفا تھے وہ
راہزن تھے اور راہزنوں کے راہنما تھے وہ
اور وارثانِ قاتلانِ کربلا تھے وہ
دیکھو خدا کے فضل سے ہیں برگ و بار ہم
دشمن خزاں خزاں ہے اور بادِ بہار ہم
گردو غبار وہ ہوئے مشکِ تاتار ہم
ان کا نصیب دشت ہے اور لالہ زار ہم
نفرت ہے ان کے دل میں کرتے ہیں پیار ہم
وہ سنگ راہ آن بھی اور کوہسار ہم
ہم اہلِ دل تھے اور موقع پرست وہ
پہنچے تھے اپنے زعم میں افلاک ہفت وہ
سمجھے تھے کم نگاہ کہ لکھتے ہیں بخت وہ
حاکم تھے اور صاحبانِ تاج و تخت وہ
پھر یوں ہوا کہ کھا گئے سارے شکست وہ
ہم ایک جان آج بھی اور لخت لخت وہ

طفیل عامر

دُور یا قریب سے پکارو بھی
ماردینا ہے اگر تو مارو بھی
خواب ہے تو خواب بھی کب تلک
! چاند کو زمین پر اُتارو بھی
! نہیں ہے کوئی چارہ تو کرو گے کیا
گزرتی ہے یہ جس طرح گزارو بھی
ہو کسی کے گر غلام تو ہے خیر
زندگی تو اپنی ہے سنوارو بھی
مفہوم بھی سمجھتے ہیں نگاہوں کا
! وارنی ہے جان تو اب وارو بھی
دلکشی بھی خدا کی دین ہے
روپ گر نکھرتا ہے، نکھارو بھی
جیت ہی جانا نہیں عامرؔ ضرور
ہو سبب کوئی اگر ہارو بھی

مرزا غالب

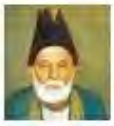

درد ہو دِل میں تو دُوا کیجئے
دِل ہی جب درد ہو تو کیا کیجئے
ہم کو فریاد کرنی آتی ہے
آپ سُنتے نہیں تو کیا کیجئے
اِن بُتوں کو خُدا سے کیا مطلب
تُوبہ تُوبہ، خُدا خُدا کیجئے
رنج اُٹھانے سے بھی خوشی ہوگی
پہلے دِل درد آشنا کیجئے
عرضِ شُوخی نشاطِ عالم ہے
حُسن کو اور خودنما کیجئے
دُشمنی ہو چُکی بقدرِ وفا
اب حقِ دوستی ادا کیجئے
موت آتی نہیں کہیں غالب
کب تک افسوس زیست کا کیجئے

پالتو جانورں کا ذکر

ابن انشاء

بھلا ایسا بھی کوئی گھر ہے جس میں ایک نہ ایک پالتو جانور نہ ہو گائے نہیں تو بھینس، بھیڑ نہیں تو بکری۔ کتا نہیں تو بلّی، گھوڑا نہیں تو گدھا. جانور پالنا بڑی اچھی بات ہے. یہ صرف انسان کا خاصہ ہے. آپ نے کبھی نہ دیکھا ہوگا کہ کسی طوطے نے خرگوش پالا ہو، کسی مرغی نے کوئی بلّی پالی ہو، یا کسی گدھے نے کوئی گھوڑا پالا ہو گدھا بظاہر کیسا بھی نظر آئے ایسا گدھا بھی نہیں ہوتا. پہلی قسم: دُودھ دینے والے جانور مثلاً گائے، بھینس، بکری وغیرہ دوسری قسم: دُودھ پینے والے جانور مثلاً بلّی، کبھی سامنے کبھی چوری چھپے۔ تیسری قسم: جو نہ دودھ دیتے ہیں نہ دودھ پیتے ہیں، مثلاً مرغی، کبوتر، طوطا وغیرہ چوتھی قسم ہم بھول گئے ہیں، اس لئے اسے نظر انداز کرتے ہیں، اور تھوڑا تھوڑا حال ان جانوروں کا لکھتے ہیں۔

بھینس

بہت مشہور جانور ہے، قد میں عقل سے تھوڑا بڑا ہوتا ہے۔ چوپایوں میں یہ واحد جانور ہے کہ موسیقی سے ذوق رکھتا ہے۔ اسی لئے لوگ اِس کے آگے بین بجاتے ہیں. کسی اور جانور کے آگے نہیں بجاتے۔ بھینس کبھی دودھ دیتی ہے لیکن وہ کافی نہیں ہوتا۔ باقی دودھ گوالا دیتا ہے اور دونوں کے باہمی تعاون سے ہم شہریوں کا کام چلتا ہے۔ تعاون اچھی چیز ہے لیکن پہلے دودھ کو چھان لینا چاہیئے تاکہ مینڈک نکل جائیں۔ بھینس کا گھی بھی ہوتا ہے، بازار میں ہر جگہ ملتا ہے۔ آلوؤں، چربی اور وٹامن سے بھرپور۔ نشانی اس کی یہ ہوتی ہے کہ پیپے پر بھینس کی تصویر بنی ہوتی ہے اس سے زیادہ تفصیل میں نہ جانا چاہیئے۔ آج کل بھینس انڈے نہیں دیتی۔ مرزا غالب کے زمانے کی بھینس دیتی تھی۔ حکیم لوگ پہلے روغنِ گُل بھینس کے انڈے سے نکالا کرتے تھے. پھر دَوا جتنی ہے وہ بھی نکال لیا کرتے تھے۔ بہت سے امراض کے لئے مفید ثابت ہوتی تھی۔

گائے

رب کا شکر ادا کر بھائی جس نے ہماری گائے بنائی

یہ شعر مولوی اسماعیل میرٹھی کا ہے۔ شیخ سعدی وغیرہ کا نہیں۔ گائے بھی خوب جانور ہے دودھ کم دیتی ہے۔ عزت زیادہ کراتی ہے، پرانے خیال کے ہندو اسے ماتا جی کہہ کر پکارتے ہیں، ویسے بچھڑوں سے بھی اس کا یہی رشتہ ہوتا ہے۔ صحیح الخیال ہندو گائے کا دودھ پیتے ہیں، اس کے گوبر سے چُوکا لیپتے ہیں لیکن اس کو کاٹنا اور کھانا پاپ سمجھتے ہیں۔ ان کے عقیدے میں جو گائے کو کاٹتا ہے، اور کھاتا ہے سیدھا نرک میں جاتا ہے، راستے میں کہیں دم نہیں لیتا۔ یہی وجہ ہے کہ گائے دودھ دینا بند کر دے تو ہندو اسے قصاب کے ہاتھ بیچ دیتے ہیں۔ قصاب مسلمان ہوتا ہے، اُسے ذبح کرتا ہے اور دوسروں کو کھلاتا ہے، تو سارے نرک میں جاتے ہیں۔ بیچنے والے کو روحانی تسکین ہوتی ہے، پیسے الگ ملتے ہیں۔ جن گائیوں کو قصاب قبول نہ کریں انھیں گئو شالاؤں میں رکھا جاتا ہے، جہاں وہ بھوکی رہ کر تپسیا کرتی ہیں، اور سّوؤں کے ٹھونگے کھاتی پرلوک سدھارتی ہیں۔ غیر ملکی سیاح ان کے فوٹو کھینچتے ہیں، کتابوں میں چھاپتے ہیں۔ کھالیں برامد کی جاتی ہیں۔ زرِمبادلہ کمایا جاتا ہے۔

شاستروں میں لکھا ہے کہ دُنیا گائے کے سینگوں پر قائم ہے۔ گائے خود کس چیز پر کھڑی ہے۔ اس کا گوبر کہاں گرتا ہے، اور پیشاب کہاں جاتا ہے۔ یہ تفصیلات بخوفِ طوالت شاستروں میں نہیں لکھیں۔

بھیڑ

بھیڑ کی کھال مشہور ہے، بھیڑ کی چال مشہور ہے اور بھیڑ کا مال بھی مشہور ہے۔ بہت کم بھیڑیں عمرِ طبعی کو پہنچتی ہیں جو رشتہ شیر بکری سے ہم نے بیان کیا ہے، وہی رشتہ بھیڑ کا بھیڑیے سے ہے۔ بھیڑیں کئی طرح کی ہوتی ہیں۔ سفید بھیڑیں، کالی بھیڑیں وغیرہ، لیکن

بھیڑ یا سب کو ایک نظر سے دیکھتا ہے اور یکساں چاہت سے لقمہ بناتا ہے اِس جانور میں قربانی کا مادہ بہت ہوتا ہے اور انسان اس مادّے سے بہت فائدہ اُٹھاتا ہے۔ گوشت کھا جاتا ہے، کھال بیچ دیتا ہے۔

بکری

گرچہ چھوٹی ہے ذات بکری کی، لیکن دودھ یہ بھی دیتی ہے۔ عام طور پر صرف دودھ دیتی ہے لیکن مجبور کریں تو کچھ مینگنیاں بھی ڈال دیتی ہے۔ جن بکریوں کو شہرتِ عام اور بقائے دوام میں جگہ ملی ہے، ان میں ایک گاندھی جی کی بکری تھی اور ایک انخفش نامی بزرگ کی، روایت ہے کہ وہ بکری نہیں بکرا تھا، معقول صورت۔ یہ جو شاعری میں اوزان اور بحروں کی بدعت ہے۔ یہ انخفش صاحب سے ہی منسوب کی جاتی ہے۔ بیٹھے فاعلاتن فاعلات کیا کرتے تھے، جہاں شک ہو تصدیق کے لئے بکرے سے پوچھتے تھے کہ کیوں حضرت ٹھیک ہے نہ؟ وہ بکرا اللہ اُسے جنت میں یعنی جنت والوں کے پیٹ میں جگہ دے، سر ہلا کر ان کی بات پر صاد کر دیتا تھا۔ اس بکرے کی نسل بہت پھیلی، پاکستان میں بھی پائے جاتے ہیں۔ سوتے جاگتے اس کے منہ سے یس سر، یس سر، جی حضور، بجا فرمایا وغیرہ نکلتا رہتا ہے۔ اسے بات سننے اور سمجھنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ جن ملکوں میں بہت انصاف ہو ان میں شیر اور بکریاں ایک گھاٹ پر پانی پینے لگتی ہیں، جس طرح علامہ اقبال کے ایک شعر میں محمود اور ایاز ایک صف میں کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اس میں فائدہ یہ ہے کہ شیر پانی پینے کے بعد وہیں بکری کو دبوچ لیتا ہے، اُسے ناشتے کے لئے زیادہ دور نہیں جانا پڑتا۔

گدھا

گدھا بڑا مشہور جانور ہے۔ گدھے دو طرح کے ہوتے ہیں، چار پاؤں والے اور دو پاؤں والے۔ سینگ ان میں کسی کے سر پر نہیں ہوتے۔ آج کل چار پاؤں والے گدھوں کی نسل گھٹ رہی ہے دو پاؤں والوں کی بڑھ رہی ہے۔ گھوڑے کی شکل ایک حد تک گدھے سے ملتی ہے، بعض لوگ گدھے گھوڑے کو برابر سمجھنے کی غلطی کر بیٹھتے ہیں۔ دونوں کہ ایک تھان پر باندھتے ہیں، یا ایک لاٹھی سے ہانکنا شروع کر دیتے ہیں۔ اگر گدھا اس پر اعتراض کرے تو کہتے ہیں، سنو ذرا اس گدھے کی باتیں۔ سوچنے کی بات ہے اگر گھوڑا کسی لائق ہوتا تو حضرت عیسیٰ اس پر سواری نہ کرتے، گدھے کو کیوں پسند کرتے؟ شاعروں نے بھی گدھے کی ایک خوبی کی تعریف کی ہے۔ خرِ عیسیٰ ہو یا کوئی اور گدھا اگر وہ مکہ بھی ہو آئے تو گدھا ہی رہتا ہے۔ دوسرے جانور بشمول آدمی تو اپنی اصل بھول جاتے ہیں، واپس آ کر القاب کے دم چھلے لگاتے ہیں۔

معلوم ہوتا ہے ایک زمانے میں گدھوں کی مشابہت گھوڑوں کی بجائے آدمیوں سے زیادہ ہوتی تھی۔ غالب اپنے محبوب کے دروازے پر کسی کام سے گئے اُس کا پاسبان یعنی دربان ان کو حضرت عیسیٰ کی سواری کا جانور سمجھ کر بوجہ احترام چُپ رہا، لیکن جب اُنھوں نے کنوتیاں جھاڑ کر اس کے قدم لینے کی کوشش کی تو سمجھ گیا کہ یہ تو نجم الدولہ دبیر الملک مرزا اسداللہ خاں بہادر ہیں۔ چنانچہ کما حقہ بدسلوکی کی۔

اُونٹ

اُونٹ ایک جانور ہے، اکبر الہ آبادی نے اسے مسلمان سے تشبیہ دی ہے کیونکہ مسلمان کی طرح اس کی بھی کوئی کل سیدھی نہیں ہوتی اور مسلمان کی طرح یہ بھی صحرا کا جانور ہے۔ بہت دن تک بے کھائے پیئے زندہ رہتا ہے۔ جس طرح ہر مسلمان کی پیٹھ پر عظمتِ رفتہ کا کوہان ہوتا ہے اس کی پیٹھ پر بھی ہوتا ہے۔ اُونٹ کو ڈاچی بھی کہتے ہیں، ڈاچی والیا موڑ مہار وے۔ ریلوے والوں نے آج کل اس کو پہیے لگا دیئے ہیں اور ایکسپریس بنا دیا ہے۔ عربی میں اسے ناقہ کہتے ہیں۔ حضرتِ قیس کی محبوبہ لیلیٰ ہی نہیں اس زمانے کی سبھی عورتیں ناقے پر سوار ہوا کرتی تھیں۔ بعد میں ہند کے شاعروں، صورت گروں اور افسانہ نویسوں کے اعصاب پر سوار ہونے لگیں کیونکہ اس میں ہچکولے کم لگتے ہیں۔ آرام زیادہ رہتا ہے۔

کتا

کتا پالتو جانور ہے۔ ہمارے شہر کی کارپوریشن اسے پالتی ہے اور مختلف علاقوں میں چھوڑ دیتی ہے۔ کارپوریشن اور بھی کئی

جانور پالتی ہے مثلاً مچھر، مثلاً چوہے۔لیکن بھونکنے والا جانور یہی ہے۔ کتابوں میں آیا ہے کہ جو کتے بھونکتے ہیں وہ کاٹتے نہیں۔کاٹنے والے کو بھونکنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔بھونکتا وہ ہے جسے کاٹا جائے جس کو گزند پہنچے۔کتا بڑا وفادار جانور ہے، کارپوریشن بھی اس کی بہت وفادار ہے۔جن دنوں میں کتّے شہریوں کو کاٹتے ہیں، کارپوریشن بھی ان کی ہمدردی میں کاٹنا شروع کر دیتی ہے کہ یہ ٹیکس لاؤ، وہ ٹیکس لاؤ۔ناطقے کے علاوہ بھی کبھی کبھی پانی بند کر دیتی ہے جس سے لوگ خیال کرتے ہیں کہ کارپوریشن کا شجرہ حضرت امام حسینؑ کے کسی صاحبِ اقدار ہمعصر سے جا ملتا ہے۔کارپوریشن کے علاوہ نجی شعبے میں بھی کتے ہوتے ہیں۔رئیسوں کے کتے غریبوں پر بھونکتے ہیں۔غریبوں کے کتے اپنے آپ پر بھونکتے ہیں۔کتا اپنی گلی میں شیر ہوتا ہے، جس طرح شیر کسی دوسرے کے گلی میں کتا بن جاتا ہے۔

کتوں اور عاشقوں میں کئی چیزیں مشترک ہیں۔دونوں راتوں کو گھومتے ہیں اور اپنا اپنا کلام پڑھ پڑھ کر لوگوں کو جگاتے ہیں۔اور اینٹ اور پتھر کھاتے ہیں۔ہاں ایک کتا لیلیٰ کا بھی تھا۔لوگ لیلیٰ تک پہنچنے کے لئے اس سے پیار کرتے تھے۔اس کی خوشامد کرتے تھے جس طرح صاحب کے سیکریٹری یا چپراسی کی کرنی پڑتی ہے۔

آدمی

دودھ دینے والے جانوروں میں پالنے کے لئے سب سے اچھا یہ ہے۔یہ نوکری کرتا ہے، دوکان کرتا ہے، تنخواہ لاتا ہے، بچے کھلاتا ہے، انھیں پیٹھ پر بٹھاتا ہے۔عجیب شکلیں بنا کر ہنساتا ہے، بہلاتا ہے۔اپنی مادہ کی خدمت میں جتنی دوڑ دھوپ یہ کرتا ہے کوئی اور جانور نہیں کرتا۔اسی لئے تو اس کے سینگ غائب ہو گئے ہیں، کھر گھس گئے ہیں اور دُم جھڑ گئی ہے۔اس جانور کا پالنا اور سدھانا سب سے آسان ہے۔اسے طوطے کی طرح بولنا بھی سکھا سکتے ہیں۔ایک آسانی یہ بھی ہے کہ گھر میں اس کے لیے الگ تھان یا پنجرہ بنانے یا زنجیر ڈالنے کی ضرورت نہیں ہوتی، جس کمرے میں چاہو سُلا دو بھاگتا نہیں۔

شیر

شیر آئے، شیر آئے، دوڑنا۔آج کل ہر طرف شیر گھوم رہے ہیں۔دھاڑ رہے ہیں۔!یہ شیرِ بنگال ہے۔!! یہ شیرِ سرحد ہے۔یہ شیرِ پنجاب ہے۔لوگ بھیڑیں بنے اپنے اپنے باڑوں میں دبکے ہوئے ہیں۔بابا حفیظ جالندھری کا شعر پڑھ رہے ہیں۔شعروں کو آزادی ہے۔آزادی کے پابند رہیں۔جس کو چاہیں، چیریں پھاڑیں۔کھائیں پئیں آنند رہیں" شیر یا تو جنگل میں ہوتے ہیں۔یا چڑیا گھر میں۔یہ مُلک یا تو جنگل ہے۔یا چڑیا گھر ہے۔یا پھر قالین کا ہوگا۔یا پھر کاغذ کا ہوگا۔کیونکہ ایک شیر کاغذی بھی ہوتا ہے۔یا پھر یہ جانور کچھ اور ہیں۔آ گا شیر کا، پیچھا بھیڑ کا۔ہمارے ملک میں یہ جانور عام پایا جاتا ہے۔شیر جنگل کا بادشاہ ہے۔لیکن اب بادشاہوں کا زمانہ نہیں رہا۔اس لیئے شیروں کا زمانہ بھی نہیں رہا۔آج کل شیر اور بکریاں ایک گھاٹ پر پانی نہیں پیتے۔بکریاں سینگوں سے کُھد یڑ بھگاتی ہیں۔لوگ باگ ان کی دُم میں نمدہ باندھتے ہیں۔، شکاری شیروں کو مار لاتے ہیں۔اُن کے سر دیواروں پر سجاتے ہیں۔ان کی کھال فرش پر بچھاتے ہیں۔اُن پر جوتوں سمیت دندناتے ہیں۔لوگوں کو فخر سے دکھاتے ہیں۔میرے شیر تجھ پر بھی رحمت خدا کی۔تو بھی وعظمت کر! اپنی کھال میں رہ۔ ***

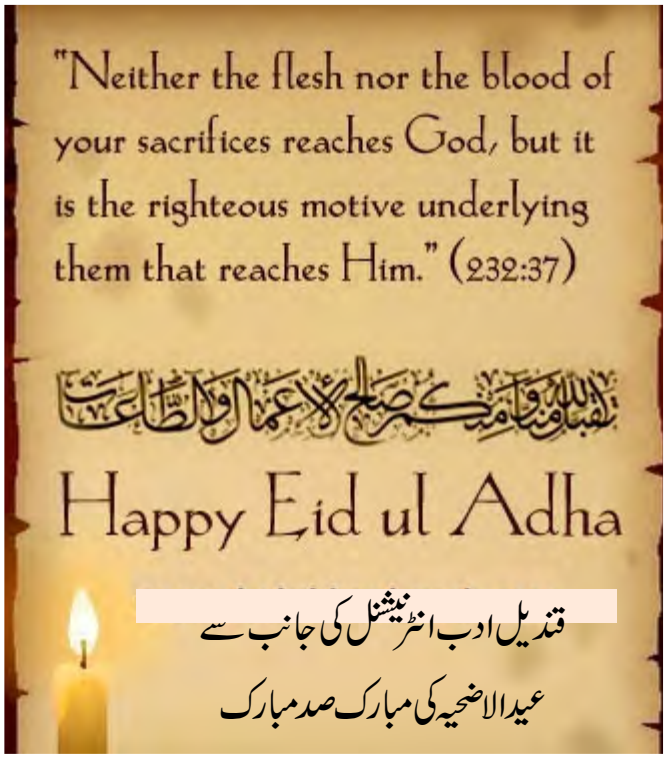

ذرّوں کی کہانی - آصف کی زبانی

دیس سے پردیس تک

(آصف علی پرویز)

دوست: پچھلی گفتگو میں آپ نے عبدالسلام صاحب کے ایم اے ریاضی کا ذکر کیا تھا اور یہ بھی بتایا تھا کہ انڈین سول سروس کے امتحانات 1947ء تک ملتوی ہو چکے تھے۔

آصف: آپ کی بات درست ہے۔ اب آپ کو ایک سال امتحان دینے کیلئے انتظار کرنا پڑتا چنانچہ آپ کے ابا جان نے میاں افضل حسین صاحب سے مشورہ کیا۔ انہوں نے کہا کہ ICS کے امتحان کیلئے 25 سال کی عمر کی حد ہے۔ اس لئے بہتر ہو کہ عبدالسلام صاحب کیمبرج سے ریاضی ٹرائی پوز حصہ دوم (Mathematics Tripos Part-II) کر لیں۔

دوست: یہ کیا تعلیمی معیار ہے؟ میں نے کبھی ایسا نام نہیں سنا۔

آصف: یوں سمجھیں کہ یہ بی ایس سی کی ڈگری لینے کے مترادف ہے۔

دوست: یہ عجیب مشورہ ہے۔ میرا تو خیال تھا کہ انہیں براہ راست Ph.D کرنی چاہیئے تھی۔

آصف: آپ یقیناً کر لیتے اور بالعموم لوگ ایسا ہی کرتے ہیں۔ لیکن میاں افضل حسین صاحب کی رائے تھی کہ جو تعلیمی بنیاد B.Sc میں بنتی ہے وہ Ph.D میں نہیں۔ چنانچہ اس مشورہ کو قبول کرتے ہوئے آپ نے مارچ 1946ء میں داخلے کی درخواست بھجوادی۔

دوست: انگلستان میں تو پڑھائی بڑی مہنگی ہے۔ تو کیا اس وقت کی حکومت ہندوستان نے آپ کو کوئی وظیفہ دیا؟

آصف: آپ تو جانتے ہیں کہ ان دنوں ہندوستان کی آزادی کی تحریک پورے زوروں پر تھی۔ اس لئے ایسے امور کی طرف توجہ کم ہی تھی۔

دوست: تو پھر آپ کے تعلیمی اخراجات کیوں کر پورے کئے گئے۔ کیونکہ میں نہیں سمجھتا کہ آپ کے والدین میں اتنی مالی استطاعت تھی کہ اپنے پاس سے اخراجات ادا کر سکتے۔

آصف: آپ کی بات درست ہے لیکن اللہ تعالیٰ کی خاص الخاص تقدیر نے اعلیٰ سامان پیدا فرما دیا۔

دوست: وہ کیسے! ذرا ہمیں بھی تو بتایئے۔

آصف: ملک خضر حیات صاحب جنگ عظیم دوم کے دوران پنجاب کے وزیر اعلیٰ تھے۔ آپ نے حکومت کی مدد کیلئے وار فنڈ War Fund کے نام سے کئی لاکھ روپے چندہ جمع کیا۔ 1945ء میں جنگ عظیم ختم ہوگئی تو انہوں نے اپنے ایک وزیر سر چھوٹو رام کے مشورہ سے اس رقم کو کسانوں کی بہبودی کے فنڈ Peasant Welfare Fund میں بدل دیا تاکہ اُس سے اُن نسبتاً غریب کسانوں کے ہونہار بچوں کو اعلیٰ تعلیم کیلئے وظائف دیئے جائیں اور شرط یہ رکھی کہ صرف ایسے کسانوں کے بچوں کو وظیفہ ملے گا جو صرف پچیس روپے یا اس سے کم مالیہ یعنی زرعی ٹیکس دیتے ہوں۔

دوست: اُس وقت کے سیاستدان بھی کتنے دیانتدار تھے۔ آج کے ہوتے تو شاید خود ہی رقم ہڑپ کر جاتے یا اپنے بچوں کے اللوں تللوں پر خرچ کر دیتے۔ کاش ہمیں ایسے سیاستدان آج بھی مل جائیں!

آصف: آپ کا کہنا بجا ہے۔ خیر! جب اس سکیم کا علم عبدالسلام صاحب کے ابا جان کو ہوا تو انہوں نے اپنے بڑے بھائی سے درخواست کی کہ اپنی کچھ زمین ان کے نام منتقل کر دیں تاکہ وہ بھی چھوٹے زمینداروں کی فہرست میں آجائیں اور یوں عبدالسلام صاحب کو وظیفہ مل جائے۔

دوست: تو کیا انہوں نے کر دی؟

آصف: جی ہاں! انہوں نے باقاعدہ قانونی طور پر زمین کا انتقال کیا اور اس طرح آپ چھوٹے کسانوں کے زمرے میں آگئے اور آپ نے عبدالسلام صاحب کیلئے وظیفہ کی درخواست حکومت پنجاب کو بھجوادی۔

دوست: تو کیا آپ کو وظیفہ مل گیا؟

آصف: اسے حسنِ اتفاق سمجھیئے یا اللہ تعالیٰ کی تقدیر کہ وظیفہ دینے والی کمیٹی

کے چیئرمین میاں افضل حسین صاحب (وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی) تھے۔ وہ عبدالسلام صاحب کے تعلیمی ریکارڈ سے پوری طرح واقف تھے۔ انہوں نے عبدالسلام صاحب اور دوسرے چار طلباء کیلئے وظیفہ کی منظوری دے دی۔ فالحمدللہ۔

دوست: کیا عبدالسلام صاحب کو کیمبرج میں داخلہ مل گیا تھا؟

آصف: عبدالسلام صاحب نے اپنی درخواست کیمبرج کے سینٹ جونز کالج St. Jones College میں داخلہ کیلئے بھجوائی تھی جو بہت دیر سے ان تک پہنچی۔ اس وقت تک داخلے مکمل ہو چکے تھے لیکن اتفاق سے ایک طالب علم (جن کا نام محمد یوسف صاحب تھا) نے اپنی داخلے کی درخواست بعض وجوہ سے واپس لے لی۔ چنانچہ ان کی جگہ پر عبدالسلام صاحب کو داخلہ مل گیا۔

دوست: یہ ہے اللہ تعالیٰ کا خاص احسان جس نے قدم قدم پر آپ کی مدد کی۔

آصف: یقیناً۔ ایسا ہی نظر آتا ہے۔

جب عبدالسلام صاحب کو داخلے کی اطلاع مل گئی تو آپ نے سوچا کہ شملہ (جہاں گرمیوں میں تمام سرکاری دفاتر منتقل ہوجاتے تھے) جا کر اپنے وظیفہ کے بارے میں پتہ کریں۔ جب آپ متعلقہ دفتر میں جانے کیلئے سیڑھیوں پر چڑھ رہے تھے تو اوپر سے آنے والے شخص نے ان سے پوچھا کہ وہ کیوں دفتر جانا چاہتے ہیں؟ آپ نے جواب دیا کہ میں وظیفے کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔ اس نے مسکرا کر جواب دیا کہ میں یہ خط آپ کو ہی پوسٹ کرنے کیلئے نیچے جا رہا تھا۔ مبارک ہو آپ کو وظیفہ مل گیا ہے۔ طبعاً آپ کو بہت خوشی ہوئی اور آپ نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا۔

دوست: داخلہ بھی مل گیا اور ساتھ وظیفہ بھی! اب تو جانے میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔

آصف: جی ہاں! اب تو سفر کے انتظامات کرنے تھے۔ دفتر میں وہ سید خالق حسین صاحب کو ملے۔ وہ داخلہ اور وظیفہ ملنے پر بہت خوش ہوئے۔ انہوں نے آپ کو مشورہ دیا کہ آپ فوراً دلی جا کر بحری جہاز پر اپنی نشست بک کرائیں۔ ساتھ ہی کمال شفقت سے ایک تعارفی خط بھی دے دیا اور پدرانہ نصیحت کی کہ ''بیٹا! ہر ایک کو سمندری سفر راس نہیں آتا۔ اس لئے اپنے ساتھ اچار اور بادام روغن لے جائیں۔''

دوست: مرض البحر ایک بڑی ہی تکلیف دہ عارضی مرض ہوتا ہے۔ حضرت چوہدری ظفراللہ خان صاحبؓ نے جب انگلستان کا سفر بغرض تعلیم کیا تو آپ بھی اس میں مبتلا ہوئے۔ اس کی کچھ تفصیل آپ نے اپنی کتاب ''تحدیث نعمت'' میں لکھی ہے۔

آصف: دراصل سمندری لہروں کی وجہ سے جہاز بہت سخت ہچکولے کھاتا ہے اس لئے شدید متلی کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ خیر! آپ وہاں سے الٹے پاؤں دہلی روانہ ہوئے اور ایک عارضی سیٹ (Standby) اپنے لئے بک کروالی۔ دفتر والوں نے مشورہ دیا کہ آپ جلد سے جلد بمبئی روانہ ہوجائیں تاکہ 18 ستمبر کو جانے والے جہاز میں سوار ہوسکیں۔ آپ دلی سے سیدھے ملتان اپنے ابا جان کے پاس پہنچے۔

دوست: داخلہ، وظیفہ اور سیٹ کا انتظام ہونے پر تو آپ کے والد صاحب ضرور سجدہ شکر میں چلے گئے ہوں گے۔

آصف: کیوں نہیں! انہوں نے ایسا ہی کیا۔ اب چند روز میں انہوں نے سفر کی باقی تیاری کرنی تھی۔ لیکن اتفاق سے ان کے پاس اتنی رقم نہیں تھی کہ ضروری چیزیں اور صندوق وغیرہ خرید سکیں۔ انہوں نے اپنے ایک پرانے دوست سے نو سو روپیہ قرضِ حسنہ لیا اور عبدالسلام صاحب کیلئے لوہے کا صندوق اور ضروری کپڑے خریدے۔

دوست: دیکھئے اللہ تعالیٰ کیسے انتظامات کرتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر عبدالسلام صاحب نے اپنی ایک تقریر میں اسے زندگی کا دوسرا بڑا موڑ قرار دیا۔

آصف: جی ہاں! اُن دنوں بکثرت فسادات ہو رہے تھے۔ اسلئے سٹیشن پر رات کو کرفیو لگ جاتا تھا۔ چنانچہ آپ نے سٹیشن پر جانے کیلئے پاس بنوا لیئے۔

دوست: کیا آپ کے ابا جان آپ کے ساتھ بمبئی تک گئے جیسے حضرت چوہدری ظفراللہ خانؓ صاحب کو چھوڑنے کیلئے ان کے ابا جان گئے تھے، جب وہ پڑھنے کیلئے انگلستان کو عازم سفر ہوئے۔

آصف: چونکہ ان دنوں بہت فسادات ہو رہے تھے اس لئے انہوں نے بھرائی ہوئی آواز میں اپنے بیٹے کو گھر سے ہی خدا حافظ کہا اور فرمایا ''بیٹا میں

گھر میں بیٹھ کر تمہارے لئے دعا کروں گا۔ اللہ تعالیٰ تمہیں اپنی حفاظت میں لے جائے۔''

دوست: تو پھر کیا اکیلے ہی گھر سے گئے؟

آصف: عبد السلام صاحب کے بچپن کے ایک دوست مرزا مرید احمد صاحب جو اس وقت پولیس میں ملازم تھے آپ کے ساتھ ہو لیئے۔

دوست: یہ تو بہت اچھا ہوا کہ ان فسادزدہ دنوں میں ایک دوست پولیس افسر آپ کے ہمراہ تھے۔ آپ نے ان کا پہلے کبھی ذکر نہیں کیا۔

آصف: مرزا مرید احمد صاحب جھنگ میں آپ کے ہمسایہ میں رہتے تھے اور ماشاء اللہ خوب لحیم شحیم نوجوان تھے اور تھے بھی خوش خور۔ جب عبد السلام صاحب گورنمنٹ کالج میں پڑھتے تھے تو مرزا صاحب ایک دن اپنے دوست عبدالسلام صاحب سے ملنے گئے تو انہوں نے کہا چلو یار! آج تمہیں بھاٹی گیٹ جا کر مچھلی کھلاتے ہیں۔ جب وہاں پہنچے تو عبد السلام صاحب نے ایک پاؤ مچھلی کا آرڈر دے دیا۔ مرزا صاحب دل میں سوچنے لگے کہ ''اونٹ کے منہ میں زیرہ'' ایک پاؤ مچھلی سے کیا بنے گا۔ کیا سلام اتنا کنجوس ہو گیا ہے! خیر جیسے ہی مچھلی کی پلیٹ ہاتھ میں آئی تو سلام صاحب نے ایک اور پاؤ کا آرڈر دے دیا اور یوں دونوں کئی ''پاؤ'' مچھلی کھا گئے۔ بعد میں سلام صاحب نے مرزا صاحب کو کہا کہ پاؤ مچھلی آرڈر کرنے کا مقصد یہ تھا کہ ہمیں گرم گرم مچھلی ملتی رہے! واہ رے آپ کی ذہانت!

دوست: دوستی نبھانی ہو تو ایسی ہو!

آصف: جب آپ بمبئی پہنچے تو آپ جہاز رانی کی کمپنی کے دفتر میں گئے اور اپنی سیٹ بحری جہاز ایس ایس فرینکونیا S.S.Frankonia پر کروالی جسے 18 ستمبر کو لورپول Liverpool روانہ ہونا تھا۔

دوست: اس رات تو پھر آپ اطمینان سے سوئے ہوں گے۔ کیونکہ مسلسل کافی عرصہ سے آپ سفر میں تھے۔

آصف: کچھ ایسا ہی تھا لیکن یوں لگا کہ آدھی رات کو شاید کوئی زلزلہ آ گیا ہو۔

دوست: کیا واقعی زلزلہ تھا یا کچھ اور؟

آصف: عبدالسلام صاحب گہری نیند سے اُٹھے تو انہوں نے محسوس کیا کہ کوئی ان کے کمرے کے دروازے کو زور زور سے پیٹ رہا ہے۔ آپ نے جلد دروازہ کھولا تو باہر دو ملٹری پولیس کے افسر کھڑے تھے۔ انہوں نے چھوٹتے ہی کہا کہ ہمیں پتہ چلا ہے کہ تم انڈین آرمی کے بھگوڑے سپاہی ہو اور ہم تمہیں گرفتار کرنے آئے ہیں۔ عبدالسلام صاحب نے انہیں بتایا کہ وہ ایک طالب علم ہیں اور انگلستان پڑھنے کیلئے جا رہے ہیں۔ انہیں اپنا پاسپورٹ اور کیمبرج یونیورسٹی میں داخلہ کے کاغذات دکھلائے تب کہیں جا کر آپ کی جان چھوٹی اور وہ افسران معذرت کر کے چلتے بنے۔

دوست: خدا کا شکر ہی ادا کرنا چاہیئے۔ اگر آج کی طرح کی پولیس ہوتی تو وہ گرفتار پہلے کرتی اور بعد میں تھانے میں جا کر ''مک مکا'' کی دعوت دیتی۔

آصف: واقعی اگر وہ افسران آپ کو غلطی سے گرفتار کر لیتے تو دنیا ایک عظیم سائنس دان سے محروم ہو جاتی۔

دوست: آپ کا بحری سفر کیسا رہا؟ کیا آپ اپنے ساتھ اچار اور بادام روغن لے گئے تھے؟

آصف: اس کا تو مجھے علم نہیں شاید لے گئے ہوں! آپ کے ہم کیبن ایس ایم مینائی تھے۔ (جو بعد میں اسلامی بینک کے نائب صدر بنے) ان کی طبیعت دوران سفر بہت خراب رہی۔ چنانچہ عبدالسلام صاحب نے اپنے سفر کا زیادہ وقت جہاز کے عرشے پر ہی گذارا۔

دوست: سفر سفر ہی ہوتا ہے لیکن بالآخر آپ اپنی منزل مقصود تک پہنچ ہی گئے۔

آصف: تقریباً اٹھارہ روز کے سفر کے بعد آپ شمالی انگلستان کی بندرگاہ لور پول پہنچے۔ سردیوں کی آمد آمد تھی اور عبدالسلام صاحب نے بہت گرم کپڑے نہیں پہنے تھے اس لئے وہ سردی سے تھر تھر کانپ رہے تھے کہ اتفاقاً حضرت چوہدری ظفر اللہ خان صاحبؓ کی نظر آپ پر پڑی جو اپنے بھائی چوہدری عبداللہ خان صاحبؓ کو لینے کیلئے آئے تھے۔ آپ نے اپنا گرم کوٹ عبدالسلام کو پہنا دیا۔

دوست: ہمارے بزرگ بھی کیسے اعلیٰ پائے کے تھے کہ خود سردی برداشت کر لی مگر ایک نوجوان طالب علم کی مدد کی۔

آصف: پھر چوہدری صاحب نے عبدالسلام صاحب سے پوچھا کہ آپ کا سامان کہاں ہے۔ تو انہوں نے اپنے لوہے کے ٹرنک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ میں کسی قلی کا انتظار کر رہا ہوں تا کہ وہ اسے سٹیشن تک لے جائے۔ چوہدری صاحبؓ نے کہا میاں! ابھی کچھ عرصہ قبل جنگ ختم ہوئی

ہے اور قلی ملنا ناممکن ہے۔ چلو ایک طرف سے ٹرنک تم اٹھاؤ۔ دوسری طرف سے میں اٹھاتا ہوں اور یوں ٹرنک کو جھولے دیتے دونوں اصحاب سٹیشن تک پہنچ گئے۔

دوست: یہ ہے کردار کی بلندی! مجھے تو آنحضورؐ کا واقعہ یاد آ گیا۔ ایک دفعہ ایک بوڑھی عورت سامان کی گٹھڑی اٹھائے مکہ میں داخل ہوئی۔ راستے میں آنحضور ﷺ نے اس کی گٹھڑی اٹھا کر اسے گھر پہنچانے کی حامی بھری۔ دوران گفتگو اس بڑھیا نے کہا کہ میں نے سنا ہے کہ مکہ میں ایک ساحر شخص نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے اس سے بچ کر رہنا۔ آپؐ نے فرمایا کہ وہ شخص میں ہی ہوں۔ اس پر اس بڑھیا نے کہا کہ میں آپؐ پر ایمان لاتی ہوں۔ ایسی بے لوث خدمت کرنے والا کبھی جھوٹا نہیں ہوسکتا!

آصف: سبحان اللہ! آپ نے کیا عمدہ واقعہ سنایا ہے۔ جزاکم اللہ۔ عبدالسلام صاحب نے حضرت چوہدری صاحبؓ کے ساتھ لندن کا سفر کیا اور وہ اپنے انگلستان کے خوبصورت اور دلکش مناظر کے بارے میں بتلاتے رہے۔

دوست: اس کوٹ کا کیا بنا!

آصف: وہ کوٹ بہت عرصہ ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کے زیر استعمال رہا۔ ایک رات لندن میں رہ کر آپ کیمبرج روانہ ہوگئے۔

دوست: آپ کو یاد ہے کہ ہم بھی پچھلے سال تعلیم الاسلام کالج اولڈ سٹوڈنٹس کے ہمراہ کیمبرج گئے تھے اور وہاں کی خوب سیر کی۔ چونکہ ہم سردیوں میں گئے تھے اس لئے ہم کشتی میں دریائے کیم River Cam کی سیر نہ کر سکے۔

آصف: جی ہاں! خوب یاد ہے۔ کیمبرج کالجوں کا شہر کہلاتا ہے اس کے سب سے بڑے کالج کا نام Trinity College ہے۔ دوسرا بڑا St Jones College ہے۔ جس میں عبدالسلام صاحب کو داخلہ ملا تھا۔ جب آپ کالج پہنچے تو وہاں کیاریوں میں لگے ہوئے گلاب کے پھولوں کو دیکھ کر دم بخود ہو گئے کہ ان پر کتنا حسن تھا۔

دوست: مجھے یاد ہے کہ ربوہ کے نیو کیمپس میں جب آپ M.Sc کر رہے تھے تو وہاں بھی سرو کے درختوں کی قطار اندر قطار خوش آمدید کہتی اور جگہ جگہ گلاب کے خوبصورت پھول تھے۔

آصف: مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ تاہم میں چند سال قبل دوبارہ اپنا کالج دیکھنے گیا تھا۔ نہ تو سرو کے درخت تھے اور نہ گلاب کے پھول!

دوست: اللہ کرے کہ کالج پھر جماعت کو واپس کر دیا جائے تا کہ اس کی پرانی رونقیں بحال ہو جائیں۔

آصف: آمین۔ اللھم آمین۔ خیر عبدالسلام صاحب نے استقبالیہ پر اپنا تعارف کرایا۔ چنانچہ آپ کو ہوسٹل میں ایک کمرہ دے دیا گیا۔ وہاں پر موجود پورٹر سے آپ نے کہا کہ ان کا صندوق ان کے کمرے میں پہنچا دے۔ پورٹر نے جواب دیا کہ یہ ہتھ گاڑی (Wheel Barrow) ہے۔ میں آپ کی مدد کر کے آپ کا ٹرنک اس پر رکھوا دیتا ہوں۔ لیکن آپ اپنے کمرے تک اسے خود ہی لے کر جائیں گے۔

دوست: یہ تو ایسے ہی ہوا کہ ''سر منڈاتے ہی اولے پڑے'' آخر اتنی بے رُخی بھی کیا!

آصف: جی نہیں۔ یہ ایسا نہیں ہے۔ دراصل اس پورٹر نے پہلے ہی دن آپکو ''اپنی مدد آپ'' کا سبق سکھلایا جس کو آپ نے اپنے پلے باندھ لیا۔

دوست: باتوں باتوں میں پتا ہی نہیں چلا کہ ہم بھی عبدالسلام صاحب کے ساتھ چلتے چلتے کیمبرج پہنچ گئے ہیں۔ لیکن یہ بھی بہت اچھا ہے۔ ان باتوں سے تعلیم الاسلام کالج کے سابقہ طلباء (اور میں امید رکھتا ہوں کہ موجودہ طلباء بھی) پڑھ کر فائدہ اُٹھائیں گے کیونکہ ان میں بڑے اور چھوٹے ہر ایک کیلئے بہت سے پیغامات ہیں۔

آصف: آپ کی بات صحیح ہے۔ چلیے اگلی محفل میں کیمبرج کی باتیں ہوں گی۔

☆☆